شاہد زبیر

نیند کا گھر

شاھد زبیرؔ

نیند کا گھر

شاہد زبیر

0323-8636111

زیر اہتمام۔ یوشع بکس

۶۹۔ نشیمن کالونی، ملتان

061-6512747

ٹائٹل گرافکس

جواد جوجی

کمپوزنگ: صلاح الدین، آکاش کمپوزنگ سنٹر، ملتان

0300-6393072

پرنٹرز: فیصل فدا پرنٹنگ پریس۔ ملتان

اشاعت مارچ 2013ء

قیمت 300 روپے

پبلشرز دستک پبلی کیشنز گول باغ۔ گلگشت ملتان

Cell: 0302-7766622(dastakpublication@yahoo.com)

منور آکاشؔ کے نام

ترتیب

نیند کا گھر.....

اس عہد کا سب سے منفرد لکھاری

میرا خیال ہے، مجھ سمیت شاہد زبیر کے بہت سے نئے اور پرانے دوست اس کی نظمیں پڑھنے اور سننے کے عادی ہو چکے ہیں۔ ہم رفتہ رفتہ، تسلسل سے، غیر محسوس انداز میں ایک خاص آہنگ، ترتیب اور تواتر سے اس کی نظموں کے باقاعدہ قاری بنتے چلے گئے ہیں۔ میں اپنے حوالے سے یہ بات یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ میں نے شاہد زبیر سے زیادہ کسی شاعر کو نہیں پڑھا۔ میں ہمیشہ اسے شوق سے پڑھتا ہوں، کیونکہ وہ میرا دوست ہے۔ میں زندگی کے حوالے سے اس کے نقطہ نظر کو جاننے کے لیئے اُسے پڑھتا ہوں، رفتارِ زمانہ وتلخی دوراں کے حوالے سے اس کے محسوسات میں پیدا ہونے والی تبدیلیوں سے آگاہی کے لیے اسے پڑھتا ہوں۔ اس کی روزمرہ کی روٹین، مشاہدات، خیالات اور دلچسپیوں کا احوال جاننے کے لیے اسے پڑھتا ہوں۔ اس کے مزاج، نظریات، تفکرات اور اعتقادات سے باخبر رہنے کے لیے اسے پڑھتا ہوں۔ اس کی معلوم اور نامعلوم تاریخ کی آگہی اس کے خوابوں اور Complexes کو جاننے کے لیے اسے پڑھتا ہوں۔ اسکی محبتوں، نفرتوں، مسکراہٹوں، قہقہوں اور آنسوؤں کو گننے کے لیے اسے پڑھتا ہوں۔ میں اسے پڑھتا ہوں کیونکہ وہ سب کچھ لکھ دیتا ہے۔ وہ جو ہو چکا وہ جو ہو سکتا ہے اور وہ جو ابھی ہونا ہے۔۔

یہ شاہد زبیر کی نیند کا گھر ہے۔ اس گھر میں خوبصورت پلنگ، آرام دہ بستر، خواب آور تکیے یا مسحور کن پردے نہیں ہیں۔ یہ سر کٹے خوابوں، ادھڑی ہوئی آنکھوں اور اپنی تعبیر دیکھ کر دہل جانے والے خوابوں کا گھر ہے۔ جس میں ہر طرف ایک عجیب سی شورش، عجیب سا انتشار اور بے یقینی پھیلی ہوئی ہے۔ یہاں جو کچھ ہو چکا وہ نہ صرف انتہائی حوصلہ شکن اور مایوس کن ہے، مستزاد یہ کہ کچھ ہو جانے کا خوف اب بھی موجود ہے۔

اس مجموعے کی بیشتر نظمیں روح عصر کی ترجمان ہیں۔ انہیں خوف دہشت اور لایعنیت کے ایام کا روزنامچہ بھی سمجھا جا سکتا ہے۔ میرے خیال میں جدید پاکستانی معاشرے کو سمجھنے کے لیے ان نظموں سے زیادہ دوسری کوئی تحریر معاونت نہیں کر سکتی۔

نیند کا گھر.....

ایک تشدد معاشرے کی عکاسی کے لیے شاہد زبیر نے روایتی سانچوں پر اکتفا نہیں کیا۔ اس نے اپنے معروض کا الگ ہی راستہ اپنایا ہے۔ اصناف کا جواز کبھی ختم نہیں ہوتا، اسی طرح اعلیٰ اور کمتر اصناف کی شمار کاری اور درجہ بندی بھی کوئی معنی نہیں رکھتی۔ مختلف ادوار، یعنی سیاسی سماجی صورتحال کے، اپنے اپنے مظاہر رکھنے والے عہود میں، مختلف اصناف، حالات وواقعات کے زیر اثر درجہ بندی میں اپنی پوزیشنیں تبدیل کرتی رہتی ہیں۔ میرے خیال میں آج کے المیے کے بیان کے لیے عروضی وگرائمری قواعد والی اصناف موزوں نہیں ہیں۔ یہ شور کا عہد ہے، بے یقینی، تشکیک، گھٹن اور درد کے مختلف ذائقوں سے، آشنائی کا عہد ہے۔ ایسے میں روایتی ذرائع اظہار کو بروئے کار لانے پر اصرار کرنا سمجھ سے بالاتر ہے۔۔ جب زندگی کا کوئی قاعدہ نہیں رہا تو زندگی کے بیان کے لیے قاعدے کی پابندی ضروری کیوں؟

ایک چینی دانشور کی بات بہت مناسب معلوم ہوتی ہے کہ ایسی تحریریں موجود ہیں جو عروض کی پابند نہ ہونے کے باوجود بہت پیاری اور دلآویز ہیں اور ایسی تحریریں بھی ہیں جو صرف ونحو کے اعتبار سے سو فیصد درست ہیں۔ لیکن ان سے گھن آتی ہے۔ شاہد زبیر کا معروض حسب حال ہے۔ وہ آج کی بات کرتا ہے۔ تمام زندہ لوگ اس کے دوست ہیں، معاشرے کے ہر پہلو، ہر تبدیلی ہر ترمیم اور ہر اضافے پر اس کی نظر ہے۔ وہ جاندار اور توانا شعور کا مالک ہے۔ اس کی نظمیں اس کے مطالعے، مشاہدے اور احساسات کا آئنہ ہیں۔ اس آئنے میں وہ خود بھی ہے اور ہم سب بھی۔۔ اس آئنے میں نہ صرف ہم اپنا اور اپنے لوگوں کا اصل چہرہ دیکھ سکتے ہیں بلکہ اپنے عصر اور تاریخ کے پورٹریٹ بھی ملاحظہ کرسکتے ہیں۔ اس سے کچھ بھی چھپا ہوا نہیں ہے اور اس کے لیے کوئی بھی نقطہ بیان کرنا مشکل نہیں۔ اس کے پاس ہر تالے کی چابی اور ہر راز کی کلید موجود ہے۔ اس کے پاس کہنے کے لیے بہت کچھ ہے اور اس کے لیے کوئی موضوع Banned نہیں وہ رکاوٹیں توڑنے اور امتناع سے بغاوت کرنے والا لکھاری ہے۔ اس کی نظم بلیک ہول اپنے موضوع اور بیان کے حوالے سے خاصی اہم ہے۔ انسانی ارتقا و تنزلی کی گڈمڈ تاریخ جسے کوئی نام دینا آسان نہیں، اس نظم میں بکھری ہوئی ترتیب سے بیان ہوئی ہے۔

نیند کا گھر.....

بلیک ہول کی گپھا میں گم لفظوں نے

مجھے الٹا کر باہر کھنڈا دیا ہے

ایک خلا میں بھٹکتے

مجھے گھنٹیوں کی آواز آتی ہے

....

مجھے لگتا تھا کہ ہول سے باہر آ کر

خالی پن میرے کام آ جائے گا

لیکن یہاں تو ہر طرف

آنکھیں نوچ کر پھینکی گئی ہیں

سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ دو دیا چکر

کیا پتھر کی زبان میں لکھا گیا ہے

یا پھر مجھے تاروں کی بولی میں رام کیا جاتا ہے

میرے اوپر چونچ میں پتھر لیے

ابابیلوں کے قافلے رقص کرتے ہیں

انسان کے ارتقا کی مختلف منزلیں، اس کے پڑاؤ اور سفر کا احوال نئی تکنیک، مختلف رنگوں اور نئے شیڈز کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ یہ بیان کسی آرکیالوجسٹ کا نہیں شاعر کا ہے۔ اس لیے اس میں فرد پر گزرنے والی واردات کو نظر انداز نہیں کیا گیا۔ اس حوالے سے انسانی ارتقا اور ترقی سبھی کچھ معکوس دکھائی پڑنے لگتا ہے۔

کوئی لمبے ڈگ بھرتا میرے پاس سے گزر گیا ہے

میں اپنے ہاتھ سے سرک جانے والا خالی پن پکڑے

بند سانس پر لٹکا ہوں

....

نیند کا گھر.....

میں تو بغیر پاؤں کا سانپ ہوں

جو ایک ہی جگہ پڑا رہتا ہے

گھسٹتا رہتا ہے

....

تمام کوشش کے باوجود میں اپنے آپ سے

بہت دور نہیں جا سکا

....

میرا کنبہ، پتہ نہیں کہاں بستا ہے

اب ایک ہی راستہ بچا ہے

مجھے بلیک ہول کی روحوں میں واپس جانا ہے

انسان کا حسن اس کی بدصورتی ہے۔ تھکاوٹ یا لاچارگی۔ انسان محبت کیے جانے کے قابل ہے یا ٹھو کے جانے کے۔ حتیٰ کے آئینے پر بھی۔ شاہد زبیر کی نظم ''چھلیڈا'' پڑھ کے یہ سوالات بے ساختہ میرے ذہن میں در آئے۔

اعضا جب جواب دے جاتے ہیں

لوگ اپنا ایمان بدل لیتے ہیں

شاہد زبیر اپنی تکنیک اور موضوعات کے بے پناہ تنوع کے حوالے سے اس عہد کا سب سے منفرد دکھاری ہے۔ چیزوں کے دیکھنے کا اس کا زاویہ، اسے ہجوم کا حصہ نہیں بننے دیتا۔ دہرائے ہوئے سچ سے کیسے بچنا ہے، یہ اسے اچھی طرح معلوم ہے اس کی تخلیقی صلاحیت پر رشک ہی کیا جا سکتا ہے کہ وہ اردو میں ایک نئے انداز اور رجحان کا بانی ہے۔

ساحر شفیق، ملتان

بلیک ہول

بلیک ہول کی گھپا میں گم لفظوں نے

مجھے اٹھا کر باہر کھنڈا دیا ہے

ایک خلا میں بھٹکتے

مجھے گھنٹیوں کی آواز آتی ہے

تپتی دھوپ کی بھٹکتی روح

چمگادڑوں کے پروں پر بیٹھ کر

میری آنکھوں کو کھنکھولتی ہے،

میری سانس کا تواتر

سوکھی کانٹے دار جھاڑیوں میں اٹکا

میرے الفاظ زخمی ہو کر، پھڑ پھڑاتے ہیں

ہجرتی پرندے، بن کر مجھ سے دور نکلتے جاتے ہیں

مجھے لگتا ہے دھاتوں سے بھری دھرتی کا بوجھ

میرے سینے پر رکھا ہے

یہ وزن اٹھانے سے میری ٹانگیں عاجز ہیں

مجھے لگتا تھا کہ ہول سے باہر آ کر

خالی پن میرے کام آ جائے گا

لیکن یہاں تو ہر طرف آنکھیں نوچ کر

پھینکی گئی ہیں،

سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ دو یا چکر

کیا پتھر کی زبان میں لکھا گیا ہے یا

پھر مجھے تاروں کی بولی میں رام کیا جاتا ہے،

میرے اوپر چونچ میں پتھر لیئے

ابابیلوں کے قافلے، رقص کرتے ہیں،

چھاؤں گہرے کنوؤں میں اتر گئی ہے

بانس کھڑے اونگھتے ہیں

کوئی لمبے ڈگ بھرتا، میرے پاس سے گذر گیا ہے

میں اپنے ہاتھ سے سرک جانے والا،

خالی پن پکڑے، بند سانس پر لٹکا ہوں

گھوڑوں کا نگران، موت کی چھڑی پکڑے

ہانپتے پمپ کی آواز میں۔

کوڑے برساتا ہے،

گھوڑوں کے پاؤں میں ریت کے پسنے کی

آواز آتی ہے

سمندر کے ادھ کھلے دروازے میں

ہوا، راستہ روکے کھڑی ہے،

اس کے سر کے بال مٹی سے اٹے ہیں

گھونسلہ دکھائی پڑتے ہیں

2

نیند کا گھر.....

وہ ایک بے باک ہنسی کے ساتھ،
تیز نوکیلے دانتوں کی نمائش کرتی ہے،
بھوت پریت کی اس دنیا میں،
دروازوں کے پٹ نہیں، صرف چوکھٹے کھڑے ہیں
دور، پیچھے کہیں، میری مکار چڑیل روتی ہے،
اسکا جسم بخار میں پھنک رہا ہے،
پرچھانواں، اسے اندر سے باہر نکلنے نہیں دیتا
اس نے ابھی ہوا میں اپنی انگلی سے
کچھ لکھا ہے، جسے میں پڑھ نہیں پایا
اس کے بین میرے خواب میں بھی، اس کی
شبیہ کو زندہ رکھتے ہیں،
پچھلی صدی کی ڈائن کا ہنکارا
بند پڑے کمرے کا طواف کرتا ہے،
میرے چھونے سے اس میں بلبلے اٹھتے ہیں،
اینٹ، لوہے اور شیشے کی قیدی،
اب بھی مجھ میں بستی ہے، میں اس میں نہیں بستا
میں تو بغیر پاؤں کا سانپ ہوں، جو
ایک ہی جگہ گھسٹتا رہتا ہے، وہیں پڑا رہتا ہے
میں نے محض کھیل ہی کھیل میں
اس کاغذ میں سوراخ کر دیا تھا،

اندر سے نکلنے والی آندھی نے،
بے ستارا آسمان کو ننگا کر ڈالا،
پانی نے ننگا ہو کر، اپنا رقص شروع کر دیا،
تارے ٹوٹ ٹوٹ کر میرا پیچھا کرتے ہیں
میں ہنستا ہوں کہ میں تو ابھی، وہیں
اوپر ہی لٹکا رہ گیا ہوں، تاروں کی پرچھائیں
مر رہی ہے، میں لفظوں کی موزونیت میں الجھا ہوا ہوں

اکیلا پن تو ایک صفت ہے
جو کسی جسم کے ساتھ
چپکی ہوتی ہے، اس کو کوٹ کر،
کوئی بت نہیں ابھرتی، کسی بسنت میں نہیں ڈھلتی
اسکو پھپھوندی چاٹتی رہتی ہے
اندھیروں کی بوچھاڑ سانس کے سناٹے میں
اترتی ہے
جسے مالک کا پیغام لا کر سنایا گیا،
وہ تو دبی روح کی اٹھکیلی تھی،
روح جو خود زخمی تھی، ٹنڈ منڈ تھی،
اپنے سارے پتے جھاڑ کر، سانس سے
بو نچوڑنے لگی

نیند کا گھر.....

تمام کوششوں کے باوجود میں اپنے آپ سے

بہت دور نہیں جا سکا، میں نے کوشش کی

امید کی ایک دنیا بساؤں اپنے اندر

نئے درخت اگاؤں، خود کو خالی کر کے

شفاف خالی پن میں، نئی آنکھیں اگاؤں

لیکن میرے الفاظ نے پوری کائنات گھوم کر

لفظوں کے مطالب کھوجے بغیر مالک کو واپس

کر دیئے

یہاں ساری دیواریں، دروازے، مکین مر چکے ہیں

میرا کنبہ پتہ نہیں کہاں بستا ہے،

اب ایک ہی راستہ بچا ہے

مجھے بلیک ہول کی روحوں میں واپس جانا ہے

مقابلہ

شام کے وقت

کتے اور بچے،

چولھے کے گرد،

ہانپتے ہیں،

گھاس پھوس کے راکھ بننے تک

بھوک سہنے کا مقابلہ جاری رہتا ہے

پرانے گیت

یہاں سارے شہر کی گندی

لا کر ڈھیر کی جاتی ہے،

شام ڈھلتے ہی

ارد گرد کی عورتیں،

سگریٹ پیتی ہیں،

گاہکوں کا انتظار کرتی ہیں،

کبھی کبھی نیا جنم لینے والے بچے

اس ڈھیر میں اتار دیئے جاتے ہیں،

باقی کام کتوں بلیوں پر چھوڑ دیا جاتا ہے

پولیس کو کبھی زندہ بچہ نہیں ملا

گھنے درختوں پر دن بھر چمگادڑیں،

الٹی لٹکتی رہتی ہیں،

رات ہوتے ہی ان کی ادھوری سرخ آنکھیں

شکار پر نکل پڑتی ہیں

اوپر ستارے چمکتے ہیں

نیچے فاختائیں پرانے گیت گاتی ہیں

سرخ آنکھیں

میں نے پوچھا تمہاری آنکھیں
ہمیشہ سرخ رہتی ہیں لیکن
تم تو نشہ نہیں کرتے،
کہنے لگا، آنکھ ماہر جسٹ کہتا ہے
یہ خشک اور بنجر رہ کر،
رنگ بدل گئی ہیں
تم زندگی میں کبھی نہیں روئے
تمہاری ماں اور باپ کی
جدائی بھی ان سے آنسو نہیں نکال سکی
ڈاکٹر نے معائنہ کے دو ہزار لے کر
کہا، تم چاہو تو آنسو لانے میں،
میں تمہاری مدد کر سکتا ہوں
میں ایک ایسی خاتون ڈاکٹر کو
جانتا ہوں جو تم سے شادی کر کے
آٹھ آٹھ آنسو رلا سکتی ہے،
تمہاری آنکھوں کی رنگت واپس لا سکتی ہے

سائیکل سوار

کبھی کبھی، اس پگڈنڈی پر
ایک سائیکل دھول اڑاتی
بھیڑ بکریوں کے گلے سے،
ڈولتی ڈالتی گذر جاتی ہے
دور کہیں کوئی بیل ڈکراتا ہے،
اس کے گلے کی گھنٹیاں بجتی ہیں
سورج پیلی پہن کر ہاتھ ہلاتا ہے،
ہوا میں خنکی آجاتی ہے
درختوں کے سائے، پگڈنڈی پر
دراز ہوتے جاتے ہیں،
میری نگاہ اب کچھ کمزور پڑ گئی ہے

دھونکنی

ٹین سے بنے چولھے میں
لکڑیاں، دھواں اگلتی ہیں
ایک موٹی دودھ والی عورت کی
پھکنی سے ہوا دیتے سانس پھول گئی ہے
سانس کے زیر و بم نے اسے
زیادہ دلکش بنا دیا ہے
میری عورت اور ماسی میں صرف
دھونکنی کا فرق ہے

حرامی بچہ

تم شہریت کا حق حلال ہونے پر
خوامخواہ مخالفت اور واویلا کرتے ہو
یہاں تو وونگ کے جنگل میں
ہزاروں خنجر لٹکتے ہیں
ہوشیار رہو، بھلائی اور بھائی چارے والا
تمہاری رگوں سے خون نچوڑ سکتا ہے
دیہاتوں میں کھیتوں کو ہتھکڑیاں لگی ہیں
آبادیوں میں پولیو والے، نوکیلے دانت نکالے
جمہوریت کا علم بلند کرتے ہیں
نفرت نے تمہیں اس مقام پر لا کر کھڑا کر دیا ہے
جہاں کم سے کم حرام کا چھوٹا بچہ
گود لینا، ضروری ہے،
ہم آج بھی ان کا انتظار کرتے ہیں
جن سے ہم تین بار ڈسے گئے، پھر بھی
ہمیں اسی بل میں ہاتھ دینا اچھا لگتا ہے،
شائد کہ کوئی اژدھا، محبِ وطن ہو
حرامی بچے سے ہماری جان چھڑا دے

ذائقے دار

لالچ کا شعور میرے
دانتوں اور جیبھ کے درمیان
بیٹھا ہے جو مرکنی ہڈی کی طرح
ذائقے دار ہے
ساری بے شرمیاں سمیٹنے کے لیئے
میری زبان باہر لپکتی ہے اور
اژدھے کی طرح دور سے اپنا شکار
حلق میں انڈیل لیتی ہے
میرا زہر بھرا لعاب پینے کے لئے
لوگ میرے دانتوں کی تلاشی لیتے ہیں
مجھے ان لوگوں سے سخت نفرت ہے، جو
اپنے پگھلے ہوئے الفاظ میزوں پر چھوڑ کر
اٹھ جاتے ہیں
اندھیرے اور کیچڑ میں لت پت یہ جانور
خوفناک بلاؤں کا روپ دھارن کرتے ہیں
میں اپنی جون بدل کر، اس کھلی کھڑکی سے
ایک سیتا کی بغل میں لیٹنے والا ہوں
ذرا موم بتیوں کو بیکار ہونے دو

کون

پل کے نیچے، ایک آدمی کی لاش
پڑی ہے، جو کل رات ٹھنڈ سے
سڑک پر مر گیا تھا،
میری آنکھیں کمزور ہیں،
یوں بھی بھیڑ زیادہ تھی،
میں اس کا چہرا دیکھ نہیں پایا
یا پھر شائد پہچان نہیں پایا
سامنے ہی میری چھوٹی سی بستی ہے
مجھے یاد پڑتا ہے، پچھلی رات
میرے پاس کمبل نہیں تھا
مجھے چاہئے تھا
اپنا کمبل
ساتھ ضرور لے لیتا،
یہ تو میری اپنی کمائی سے
خریدا گیا تھا مگر مجھ سے بھول ہوئی
میں ٹھنڈ خریدنے، نکل گیا تھا،
اب پتہ نہیں، مرنے والا کون تھا

اوب کر مرنا

میں نے کھیکوں اور کٹنیوں کو،
تنگ دھڑنگ،
سنگھاڑے توڑتے دیکھا ہے،
میں آج بھی ان کا گواہ ہوں،
میں نے انہیں بڑے دھیان سے دیکھا ہے،
ان کے برابر، بڑے مینڈک، جب
جھپاک سے کودتے ہیں،
ان کو اندازہ ہوتا ہے کہ پانی وہاں
کتنا گہرا ہے
میری دلچسپی نرسل کی ہری چھڑیوں میں ہے،
مجھے ان سے قلم بنانا آتا ہے،
کچھ کھٹیک اسے پیپری بھی کہتے ہیں،
سنگاڑے بیچتے اسے بجاتے ہیں،
ان کی راتیں، سنگھاڑے توڑتے گزر جاتی ہیں
دن گاہکوں کے ساتھ ریٹ طے کرتے
جھک جھک میں گزر جاتا ہے،
ان کا دل چاہتا ہے کہ وہ
اوب کر مر جائیں

بات چیت

اخباروں میں سرخیاں لگی ہیں،

ہر ہاتھ کٹ گیا ہے

ہر پیر ٹوٹ گیا ہے

ہر چہرہ پھولا،

پانی سے نکالی گئی لاش ہے،

ہر دماغ سے کوڑا،

بہہ نکلا ہے،

تقریر کو صندوق میں بند کرو،

میز کرسیاں سیدھی کرو،

بات کرتے ہیں

باتوں کے صندوق

بیس فٹ لمبا میز

ہٹایا جا سکتا ہے،

اور گرد لگی پچاس کرسیاں بھی

دور کی جا سکتی ہیں مگر

یہ باتوں کے صندوق

کون بند کرے گا

ستیہ وتی

میں نے زندگی بھر

سب سے زیادہ پیار

اپنی سیتا سے کیا

تم میری سیتا ہو

مجھے پتہ ہے تم پتی ورتا ہو

میرے جاتے ہی، آگ میں جل جانا

ستیہ وتی کہلانا

مرن جگ

جب ٹہنیاں مرجاتی ہیں تو

ان سے نئی شاخیں کیوں نہیں نکلتیں

ہزاروں مسمریزم جاننے والی آنکھیں

اس کو زندہ نہیں کر پاتیں

اگر یہ زندہ نہیں تو

شاخوں کے ماتھوں سے،

سلوٹیں چلی کیوں نہیں جاتیں

انہیں دھرتی کی دراڑوں میں لگا کر بھی

زندہ نہیں کیا جا سکتا

جیسے آدمی فائلوں میں مر جاتا ہے

ہذیان

ہذیان بکتے ہو اور کہتے ہو
میں زندہ ہوں
خاکی وردی پہن کر
جنگی نغمے گاتے ہو
سہارے کی تلاش میں
کسی کے بھی کندھے پر
ہاتھ رکھ دیتے ہو
تمہاری زبان سے مٹھی بھر
معنی دار لفظ برآمد نہیں ہوتے
پورے مہینے کا کوٹہ، تمہیں ایک دن
مطمئن رکھ سکتا ہے،
یہ ایٹمی مشروم ہی تمہاری دنیا ہے،
میرا خیال ہے تمہیں
خصی کہنا چاہئے

چپڑی روٹی

میری پسلیوں پر ایک
روکھا، سوکھا، چم چیچڑ ہاتھ
روئیں کھڑے کرتا، میرے گال پر
آن دھمکتا ہے
ان انگلیوں کی آنکھیں پیلی ہیں
جو مجھے لاش کی طرح گھورتی ہیں
میری پھولی ہوئی نس، آسانی سے
پکڑی جا سکتی ہے،
ہاتھ جب میرے چہرے کے کیچڑ میں اترتا ہے
بدبو کا ایک بھبھوکا جان پر سے گذرتا ہے
جب مجھے کہیں اور سے روٹی نہیں ملتی
مجھے اسی کی پرتکشیا کرنی ہے
نمک اور تیل میں چپڑی روٹی
اسی ہاتھ سے کھانی ہے

معنی کا پڑاؤ

الفاظ اپنے پنجرے توڑ کر باہر نکل آئے ہیں
سر سے سایہ اٹھتے ہی
انہوں نے اپنے معنی کھو دیئے
ان کی شناخت کہیں گم ہو گئی
میں نے اپنے الفاظ کو ریزہ ریزہ ہوتے دیکھا ہے
بیان اتنی قدرت نہیں رکھتا کہ وہ
اس لاچارگی کی تصویر بنائے
پکاسو کی تصویریں، جگالی پہ بیٹھ گئیں
سیفو کی نظمیں، کوٹھے پر رقص کرتی تھیں
دوستووسکی کی کہانیاں، ہلاک ہو گئیں
پابلو کی محبت، کرسٹو فرلی کے دانتوں میں بیٹھ گئی
سڑے ہوئے لوگوں کو کوئی صلیب نہیں ملی،
پیدائشی پناہ گزین، بد نصیب تھے، بد نصیبی
میں گم ہوئے
آنکھوں کے سوراخوں میں کیڑوں نے گھر بنا لیئے،
پسلیوں کے درمیان جونکیں نصب کر دی گئیں
کچرے کے ڈھیروں سے بدبو نکل کر، تحلیل ہو گئی
ہر طرف بارود کے درخت اگے ہیں
ہیلی کاپٹروں کی لاشیں رسی کے ساتھ
چھت کی کڑیوں سے باندھ دی گئیں
وہ سارے لفظ، وہ ساری کتابیں،
جنہیں میں بچپن سے پڑھتا آرہا تھا،
یاد کرنے کی کوشش کرتا ہوں،
گانٹھ کستا جاتا ہوں
(خالد سعید کے نام)

کوڑھ

سڑتی ہوئی، گونگی لاشوں میں اب
مرنے کی سکت باقی نہیں رہی
ان کی پسلیوں پر
آسیب نصب ہیں،
واویلا کرنے والی زبانیں
کیڑوں سے بھری ہیں
اذیت کا کوڑھ،
چہار طرف پھیلا ہے

فرق

لوہار کی دھونکنی کے سامنے،

گھوڑے بڑا سا منہ لٹکائے کھڑے ہیں

کھرپی، کدال اور نعل بنانے والا

ابھی ان کے پاؤں میں کیل ٹھونک دے گا،

گھوڑوں کا جیون تو زمین پر گذر جاتا ہے

وہ آدمی اور چوپائے کا فرق کر سکتے ہیں،

وہ چاہتے ہیں کہ ان کی دو ٹانگیں کاٹ کر

لوہار ان کے بازوؤں میں ٹھونک دے، تا کہ

انہیں کھروں پر چلنے اور پاؤں پر چلنے کا

فرق معلوم پڑ جائے

مجھے ان کی دھار والی ہنسی سنائی دیتی ہے

پُرسکون

جس کو لوگوں نے سڑک کہنا شروع کر دیا ہے

اس پر زیادہ تر بیل گاڑیاں چلتی ہیں،

اکا دکا سائیکل دھول اڑاتا بھی گزر جاتا ہے

ادھیڑ عمر کی عورتیں، دھیرے دھیرے،

بیلوں کے پیچھے، سر نہوڑائے چلتی ہیں

ان کے شوہروں کا ان سے

صرف رات بھر کا سمبندھ ہوتا ہے،

بندر ان سے شلجموں کی بھیک مانگتے ہیں

ایک آدھ گاڑی پر حقہ دھرا رہتا ہے

باری باری سب کو کش لگانے کی اجازت ہے

ساری زندگی مردوں سے احتجاج کیے بغیر

وہ سڑک کے ساتھ بہنے والی ندی کی طرح

پرسکون رہتی ہیں، بچے پالتی ہیں

کھانا بھی پکاتی ہیں

بنجر بھومی

میری بنجر بھومی میں
ایک کٹھور نائیکہ نے مجھے
نئی فصلیں اگانے کے لیے رکھ لیا تھا،
میں لمبے ناخنوں کے ساتھ
نرائی اور بوائی کے گیت سنتا،
نیلے پیلے لاچوں والی لڑکیاں،
پھر پھڑاتی میرے پاس سے گذرتیں،
میں ایک ایسی لاش کی طرح
ان کے پیچھے بہتا چلا جاتا
جیسے میری لاش پر کوے بیٹھ گئے ہوں

بے چہرہ

تیز تیز قدموں سے آنے والے
آدمی نے،
میرے برابر آن کر کہا،
یہ لو، تمہارا چہرہ،
پیچھے گر گیا تھا،
اس بھیڑ میں کسی نے
تمہیں بغیر چہرے کے دیکھ لیا تو
گرفتار کر لیئے جاؤ گے

پکاسو کی فاختہ

پکاسو کی فاختہ، آسمان کو اڑ گئی ہے
میں ہذیان میں پوچھتا ہوں
کیا تمہارے پاس روشنی ہے
جن کتابوں میں، میں نے روشنی پڑھی تھی،
سب کی سب باڑ میں بہہ گئیں
جو میرے قریب گری تھیں،
ان کے ورق، انسانی لاشوں کی طرح
پھول گئے تھے
ادھ جلے مکان، جلوسوں میں گھرے ہیں،
کچھ پتھرائی پتلیاں، تاروں پر ٹنگی رہ گئیں
بچوں کے دھڑ، بستوں سے لپٹے ہیں
ان پر جمی کائی، مکوڑوں کا راستہ ہے
کچھ آنکھیں ہیں، جو ابھی جلتی ہیں
مٹی کے تیل کی پونیاں دکھائی دیتی ہیں

کہانی کار

لیاقت کی فالتو وقت میں لکھی

پالتو کہانیاں،

اپنے بائیں ہاتھ کے خلاف

سازش کرتی ہیں، جھگڑالو

اس کے پاس کچھ ایسی کہانیاں بھی ہیں

جو اپنے ہجے بھول چکی ہیں،

وہ جس سڑک پر کھڑے ہو کر

اپنے افسانوں کو نظموں میں ڈھالتا ہے،

سمجھوتہ کا شکار ہو گئے ہیں

طلب کی عبادت میں سرشار نظام کا حصہ ہیں

تنخواہ دار، پالتو اور بنجر کا فرق مٹ گیا ہے

سارے کھیت گردی ہیں

وہ سوچ کی ہتھکڑی پہنے، حجام کا استرا اٹھا لایا ہے

بھنگی کے ہاتھ میں جھاڑو دے کر

اپنی نفرتوں کے خلاف جہاد کرتا ہے

(لیاقت علی کے نام)

ہذیان

دہشت انگیزی ایک اجتماعی

ہذیان کی صورت ہے، اسے

لوگ مزے لے کر بیان کرتے ہیں

انقلاب ایک خوبصورت چیز ہے

صرف دہشت برائی ہے

جہنم کو جاننے کے لیئے

جنت کی اصلیت جاننا ضروری ہے

لوگ آمریت پسند شاعری سے

آج بھی مسحور ہونے کو تیار ہیں

ماں کے نام سے موسوم

سہ طرفی جنس بازی کا منظر نامہ

ہذیان کی پیداوار ہے

انگلیاں

ایک سنگراش کی انگلیاں

بوڑھی، سورنی کے تھنوں سے

لگی ہیں،

قدیم یونانی عورتوں کا

لمس تلاش کرتی ہیں

جنون

جنون تو انسانی ہے

کمیونزم اور قتل بھی، انسانی ہے

کیا تم اس عالم کی تمنا کرتے ہو

جس میں انسان انسان نہ رہے

طاقت والے، لوگوں کو خوش رکھنے کے

پابند نہیں

تمام انسانی رشتوں کی کلید

جنسی تعلق میں پوشیدہ ہے

مرد اور عورت کے بیچ ہونے والا عمل

انسانی ارتقا کا آئینہ دار ہے،

مسلسل جنسی عمل، جنون پیدا نہیں کرتا

مورتی

میں نے بستر کے لئے ایک مورتی

بنوائی تھی، مگر سنگتراش نے

تھوڑی سخت رکھ دی

پتنگیں

ٹیلی فون کے کھمبے پر،

کچھ پتنگیں، پھنسی پڑی ہیں

پھڑ پھڑا رہی ہیں،

میں اس پیشہ ور پر تھوکتا ہوں

جس نے ان کو تخلیق کیا

انسانوں میں برابری کا مقام دیا،

مگر وہ، ان کے پاؤں میں زنجیر باندھ کر،

گھر سے نکلتے تھے

پتنگیں تو پیدا ہی، اڑنے کے لیئے ہوتی ہیں

یہ بندر کی جاتیاں ہیں،

باہر نکلتے ہی ادھر ادھر تاکتی ہیں

آزادی سے اڑانیں بھرتی ہیں،

ان کا انجام بھی، کٹ کر

کھمبوں پر لٹکنا ہے

فتوئ ریگستانی میں لکھا ہے،

اڑنے والی پتنگوں پر

کارو کاری کا اطلاق ہوتا ہے

جوتیاں

ہر کوئی جوڑیاں لے کر آجاتا ہے،

پتہ نہیں کیوں لوگ، ناپ سے باہر

جوتیاں پہنتے ہیں،

ایک صدی کے پھٹے جوتوں کو

ٹانکے لگانا، بڑا اذیت ناک ہوتا ہے

مجھے ایک کونے سے باہر نکلی

انگلیاں دکھائی پڑتی ہیں تو دل پر

شدید چوٹ لگتی ہے،

کئی جوتوں کے چہروں پر

چیچک کے داغ ہوتے ہیں

اور کچھ پولیو زدہ

کچھ کے منہ سوجے ہوئے،

کسی کے دانت نکلے ہوئے

بعض چہروں کی رنگت

وقت نے وقت سے پہلے چھین لی،

گھروں میں پھٹکاری گئی پمپیاں

نشوونما کی رنگت دیکھے بغیر

جل مرتی ہیں اور کچھ

ادھیڑ عمری میں بھی،

پالش کے زور پر چمکتی ہیں

کچھ مردانہ بوٹ عرصہ دراز تک

ہنڈائے گئے ہوتے ہیں، لمبے پاؤں

جب سلائیاں پھاڑ کر نکلتے ہیں تو

ان کو ٹانکے لگانا، آسان نہیں ہوتا

جوتیوں کے پھٹنے میں ہی ان کی بقا ہے

عمر قید

سوتری وٹ کی عورت میں،

نہ خون ہے، نہ بدن پر ماس ہے،

ہڈیاں بھی ندارد،

اسے عمر قید کی سزا دی گئی تھی

یہاں کی فضا اسے راس آگئی ہے

باہر نکلنے کی خواہش ہنوز باقی نہیں رہی

بس ایک ٹکے رہنے کی مشقت ہے

بار بار اپنی جگہ سے کھسک جاتی ہے

اس پر بونے لوگوں کا آسمان، سنا ہے

سنی سنائی باتوں کی بنیاد پر

باہر کی دنیا کا نچ پن

اس کے مسام بھگوئے رکھتا ہے

چھلیڈا

جنگل میں، کوئی کسی کا دوست نہیں ہوتا

میں نے الٹے پاؤں والیوں کے ساتھ

رہتے ہوئے، اپنے اگلے پاؤں پر چلنا

سیکھ لیا ہے،

اس کے لیئے مجھے کڑی آزمائش سے

گزرنا پڑا،

انہوں نے میرا سینہ چاک کر کے

میرا دل نکال لیا

میرے صندوق میں ایک چھلیڈا ارکھ کر

باہر سے تالا ڈال دیا،

اس بات کو عرصہ گذر گیا

تالا بھی زنگ کھا چکا

چھلیڈے نے مجھے، دور دراز آسمانوں کی

سیر کرائی، نئے نظارے دکھائے

میں نے ہر نیا رنگ چکھا،

مجھے لگتا ہے، وہ چھلیڈا اب

بوڑھا پڑ گیا ہے، اٹھتے بیٹھتے

نماز پڑھتا ہے،

اعضا جب جواب دے جاتے ہیں

لوگ اپنا ایمان بدل لیتے ہیں

تلوے

عورت کی پیشانی سے پاؤں تک

پھسلنے میں صرف

ایک سانس کا فاصلہ ہے

عورت کے جسم میں عریانی کے سوا کچھ نہیں ہوتا

اگر وہ تھوڑا سا مسکرا دے تو میں

اس کے تلوؤں میں عمر گذار سکتا ہوں،

تا آنکہ سانس لینا دشوار ہو جائے

وہاں دلدل نہیں تھی

میں جہاں پاؤں رکھتا ہوں

پھسل کر گر جاتا ہوں

تیزی سے اٹھ کر کہتا ہوں

اوہ، میں پھسل گیا تھا

حالانکہ

مجھے پتہ ہے، وہاں کوئی دلدل نہیں تھی

میں پھسلا نہیں، لڑھک گیا تھا

ہڑبڑی

چہروں پر ہڑبڑی ہے

چور کیل، کہیں دبی رہ گئی ہے

زندہ رہنے کے لیئے ایک صحیح دلیل درکار تھی

ورنہ رنڈیوں کا کاروبار

منافع بخش ہے

سب سے آسان کام، جھوٹ بول کر

بھیڑ کا حصہ بننا ہے

دھوپ کو سوکھنے کے لیئے لٹکانے سے

کسی کو کچھ پتہ نہیں چلتا

جس پر دم کیا گیا، اس بچے کو کیا خبر

چہرے کی شرافت کے پیچھے

استھان پر بیٹھا، شاخ ہی کاٹ گیا

اکھروں کے اندھے، صحت پا کر

شبدوں میں چیخیں مارتے ہیں

چہروں اور چیخ، دونوں کی

اپنی اپنی بھاشا ہے

استقبال

بھونکنے والے اکھروں نے

میرے کالے جوتے پہچان لئے تھے،

وہ برسوں سے میرا تعاقب کرتے رہے تھے،

میری مٹی میں اگرچہ کوئی بو نہیں تھی،

اور پاؤں کے نشان بھی مٹی میں کھو چکے تھے

ان پر سے ہزاروں گھوڑوں کی ٹاپیں

دھول گذار چکی تھیں

کسی نے ان سے کوئی

کانا پھوسی کی تھی

کالی بستی کے کالے کتے

پرانے اکھر، منہ میں لئے

ہاتھوں میں ہار پکڑے

میرے استقبال کو آئے تھے

بانس پر، ایک کالی لیر،

پھڑ پھڑا رہی تھی

نابالغ شاعری

میں پھسل کر، اس کے بدن میں جا گرا تھا،
اس کی پنڈلیاں بڑی آرام دہ تھیں،
میں نے اپنی ساری نابالغ شاعری
اسی کنج میں بیٹھ کر، تخلیق کی
میرے پاس بہت تھوڑے لفظ تھے مگر
وہ اس کے ایک ایک عضو کا
طواف کرتے، میں منکوں کی طرح ان کی
گرہیں بناتا
وہ ہمیشہ ایک دوسرے میں،
گڈ مڈ ہو جاتے، میری نظموں کو
تہس نہس کر دیتے،
میں نئے لفظ کہاں سے لاتا
کاش میں اپنے ساتھ گنتی بھی لایا ہوتا
عددوں کا کھیل الفاظ کے گورکھ دھند سے
لاکھ گنا دلچسپ ہوتا ہے،
لفظوں کی جگالی کرنے سے، منکہ گرانا کتنا
آسان ہے
جب مجھے شراپ ملا تھا تو میں حساب کتاب
سے ہی
جنجال سے نکلا تھا،
لفظوں کو ایک کے اوپر ایک ٹکانے سے
جلد کے آرپار نہیں دیکھا جا سکتا،
پھڑ پھڑاتا جھنڈا کہنا آسان ہے یا ایک

خالی جگہ

بہت سے الفاظ
میرے پاؤں تلے آن کر
کچلے گئے ہیں،
میں پیٹ کی بھول بھلیوں تک
گھر گیا ہوں
اس خالی جگہ پر کسی عورت کو داخل کرو
مجھے ابجد تراشنے نہیں آتے
یہ ہلتی جلتی عورت ہے یا ساکن
پہلے یہ طے ہونا ضروری ہے کہ وہ
واقعی عورت ہے بھی سہی،

سرگوشیاں

میں پرانی رسموں اور بے معنیٰ رواجوں پر
یقین نہیں رکھتا،
مشتبہ کردار کی عورت کو گھر میں رکھنا
مشکل کام ہے،
فلسفی اب اچھے مقرر کے طور پر
مشہور ہو گئے ہیں،
ان کا موضوع، مساوات اور عیش وعشرت ہے
دیکھو یہ میری پہلی یاترا ہے
مجھے لگتا ہے، میری کوئی چیز، اس کے جسم کے
ساتھ رہ جائے گی
دریا کا ریتلا پاٹ سورج کی روشنی سے
چمک اٹھا ہے،
روشنی اور زمین کا لمس جاننے والا
مرا ہوا نہیں ہوتا،
خود کلامی مریضانہ جذباتیت پر مبنی تھی،
بے چینی، مساموں سے حدت بن کر
اُبلتی، ہوا ہوئی
خبریں، کھڑکیوں سے نکل کر، جنگلوں سے گذرتی
تاروں میں پھیل گئیں
سرگوشیاں، جنتریاں نکالے بیٹھی ہیں

آخری نشانی

اگرچہ، یہ میری بیوی کی چارپائی ہے
جس پر اس نے میرے چاروں بیٹوں کو
جنم دیا،
اسی پر اس کی دوشیزگی، لہو نہائی تھی
تم اسے بیچ سکتے ہو
آدمی بھاگ کر، گھر پہنچے بھی تو
کچھ تھپڑ، کچھ گھونسلے، اس کا
اضافی تجربہ ہوتے ہیں
ماتمی دھاڑیں اٹھنے سے پہلے
چارپائی کے گھر چھوڑنے تک، بچے
خریدار کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں
جس غم نے اندر سے، تمہیں بھینچ کر رکھا ہے
وہ تمہاری کمر سے ہوتا ہوا
تمہاری ٹانگوں میں اتر رہا ہے
فاقہ کرنے سے، زمین پر سونا اچھا ہے
بیٹھ جاؤ

مروت

کونج کی مروت سے چاند
گھر کا رستہ بھول گیا
وقت قیمتی شے ہے
زمانے پلٹا کھا گیا ہے
آجکل کی لڑکیاں، ویسی شادی کرنا
نہیں چاہتیں جیسی ان کی
ماؤں، نانیوں یا دادیوں نے کیں
ان کا خیال ہے کہ زندگی، اکٹھے
گذارنے کے لیئے کسی پادری یا مولوی کی
ضرورت نہیں
آپ کے پیدا کردہ بچے ہر حال میں
آپ ہی کے رہتے ہیں
اس صورتحال کا اندازہ کر کے
حکومت نے شناختی کارڈ کے خانے میں
باپوں کے نام کا اندراج بے معنیٰ
قرار دے دیا ہے
اس طرح اکٹھے رہنے میں، شادی کرنے اور
طلاق دینے کے جھمیلوں سے نجات مل جاتی ہے
وقت کی بچت ہوتی ہے

شکتی

چاروں طرف سے آن کر پانی
بھرتا رہتا ہے، پھر بھی سمندر
اپنی حدود کو نہیں چھوڑتا
جوں کا توں بنا رہتا ہے
دودھیا چاند بھی، درخشاں ہیں
شائد وہ اپنی باری کا انتظار کرتے ہیں
وہ اپنے گرز لئے، سمندر کے سینے پر
اترتے ہیں، انہیں ہاتھیوں کی سونڈ کی طرح
لہراتے ہیں
ان کے گرز، غصے سے تمتماتے ہیں
اگر یہ آپس میں ٹکرا گئے تو
ایک نا قابل برداشت دھماکہ ہوگا
متحارب پہاڑوں کے درمیان راستے بناؤ
اور انہیں باری باری توڑ کر،
زمین پر دے مارو، یہ پانی کی طرح
سب کچھ اپنے اندر دفن رکھنے میں شامل ہیں

گروی

کبھی کبھار، دم بھر کو میں اونگھ جاتا ہوں
پرانے ناسوروں میں چیونٹے لگتے ہیں
سرکار عالیہ سے ملا رومال، پھر سے
میرے آنسو خشک، سر نیچا اور زبان گنگ کر دیتا ہے
ساری رات، ہاتھوں کو گھٹنوں میں دابے
گھنی خشک ہچکیاں لیتا ہوں
بیمار کے جیسی آواز، کبھی کبھی، دانت توڑ کر
محلے میں پھیل جاتی ہے، اسی لمحے میری
سسکی کا بوجھ، شہتیر کی طرح آن گرتا ہے
اپنی فتوئی کو دیکھ کر مجھے ایک انگیا کی یاد آتی ہے
مگر میری سوچ تو ایک بھوت کے پاس گروی ہے

جوہر

طوائفوں، دلالوں اور بدمعاشوں کی شکل میں
انسان کی نسل اس کا اثباتی جوہر
تلاش کیا جا سکتا ہے
محض سماجی آواز
ان کے قلب کی ماہیت
بیان نہیں کر سکتی

گڈمڈ پیغامات

مٹی سے کھلونے بنائے جاتے وقت
بہت سے سوال پوچھے جا سکتے تھے
لیکن اس وقت کوئی زبان ایجاد نہیں ہوئی تھی
کچھ بلبلیں ایسی پیدا کی گئیں
جو نثری نظموں میں
مصرعوں، لائنوں کی آنکھیں کھولتیں
ایک ہی شاخ پر بیٹھ کر چہارتیں
بلاناغہ بلاغت کی بوچھاڑ کرتیں
پھر کچھ روحانی پروں والی مخلوق نے
چٹانوں، پر مٹی کے خالق کے احکامات
لکڑی، پتھر سے لکھ ڈالے جو
ان کی ذات میں اتر کر، گڈمڈ ہو کر
نسلوں کی تہوں میں گم ہوئے
بجلی کڑکتی رہی، پیغام روشن ہوتے رہے
آخر لوگوں نے بڑی ذہانت سے، ان سے
پیچھا چھڑا لیا اور
اپنے آپ میں گم ہوئے

بے شرمی سے چلے آنے والے

میں کبیدہ خاطر ہوں

پوچھے بغیر زبردستی چلا آیا ہوں

میرے ساتھ وہی سلوک روا ہے جو

بے شرمی سے چلے آنے والوں کے ساتھ

روا رکھا جاتا ہے

کوئی مجھ پر صندل اور گلاب کا عرق

چھڑکنے پر راضی نہیں ہوتا

میں، اگرچہ لوگوں پر بادل اور دھند بھیج کر

ان کی کوتاہیوں کو پوشیدہ رکھتا ہوں

مگر بادشاہ کے بیٹے

نچلی ذات کے لوگوں کے ساتھ لڑائی کو

اپنی توہین جانتے ہیں

میں لوگوں کو مطمئن نہیں کر سکتا

وہ گنگ کھڑے رہتے ہیں

مبہوت

ریگ اڑی تو، شب درِ مرگ پہ آئی

میں اپنے کلبوت میں، مبہوت رہا

بدنوں سے خارج لوگ

محبت میں گرفتار ہونا، ابتلا ہے

ذہن کا بوجھ، کندھوں پر حاوی ہے

سردی، دھوپ کا سایہ مانگتی ہے،

سارے شہر کے نابینا، بیدار ہیں،

سامنے روشن راہوں کے

دھوکے پھیلے ہیں

آنکھوں کے اختیار میں

خُو کی کمی ہے

چھپا کے رکھو، اپنے ہجر کا دکھ

جرم کی پاداش میں سلے لب

بے نواؤں میں زبانیں بانٹتے ہیں

ندامتوں کے اثاثے باندھ کر رکھنا

پچھلے پہر کی نیند پر قابو پالو

کنارے پر ٹھہری سوچ، اب تک

تمنا کے اس پار نہیں اتری

پتھر بدست لوگ، رینگ رینگ کر،

صحرا کی کشادہ ریت، پھانکتے ہیں

اہل فکر کے قلب پر اترتے صحیفے

آتے ہیں مگر

میں اپنے بدن میں نہیں ہوں

یہ جن بھی عجیب ہوتے ہیں

یہ جن بھی نا، بڑے عجیب ہوتے ہیں
میں انہیں دیکھ کر دنگ رہ جاتا تھا
میری آنکھیں، حیرت سے پھیل جاتیں
نگری میں چار طرف، دہشت پھوٹ پڑتی
وہ میرے پیچھے چلتے مگر ان کے قدموں کی
چاپ نہیں ہوتی تھی
وہ یقین اور وہم کے درمیان لٹکے ہوتے
کسی کو اپنے اندر نہیں آنے دیتے اور نہ ہی
باہر نکلنے دیتے تھے
ایک دن میں اچانک
زمین پر گر کر ڈھیر ہو گیا
میں نے دیکھا کہ ان کا پتہ پانی ہو گیا تھا
انہیں اپنے ہاتھ پاؤں کی پڑ گئی تھی
وہ سب میرا پیچھا کرنے پر نادم تھے
انہوں نے مجھے اٹھایا اور کندھوں پر لاد کر
ایک ہسپتال کی طرف بھاگے
ڈاکٹر کہتے ہیں میں انہیں
صدر دروازے کے باہر پڑا ملا تھا
اب میرے پیچھے کوئی نہیں چلتا
گویا وہ کبھی تھے ہی نہیں

ویگاس

یہ سب
عیاری اور مکاری کے پتلے ہیں
دشمنوں کو خاک میں ملانے کے
منصوبے باندھنے میں لگے رہتے ہیں
دغا و فریب کے طریقے سوچتے ہیں
محبت کا پیغام بھیج کر بلائے گئے لوگوں کو
پانسوں سے دل بہلانے کا وردھان دیتے ہیں
جو کھیلنے والے شوق ہی شوق میں
جان پر کھیل جانے کے چنگل میں جا بیٹھتے ہیں
جو منڈپ میں دنیا کے چار کونوں سے
امراء جوق در جوق، اترتے ہیں،
عورتیں ساتھ لاتے ہیں
نہ لا سکنے والوں کو مہیا کر دی جاتی ہیں
نئے جواریوں کو ایک دو پانسے جتوا کر
پھر پانسہ پلٹ دیتے ہیں
پہلے یہ دل ہارتے ہیں، پھر خزانہ خالی ہوتا ہے
آخر میں کنیزیں داؤ پر لگتی ہیں

ور

میں بوڑھا ہو چکا تھا
وہ عالم شباب میں تھی
ستیہ وتی تھی، یوجن گندھا تھی
اس کی خوشبو چار کوس تک پھیلی تھی
عمروں کی تفاوت نے ہمیں ایک ہونے نہ دیا
میں جو بظاہر خوش وخرم تھا، لیکن اندر سے
اسے فراموش نہ کر سکا
اس کا حسن وشباب میرے ذہن کو جکڑ چکا تھا
میرا دل مغموم رہنے لگا، بدن سوکھنے لگا،
ہر چند کہ میں نے اس کو راز رکھا، مگر
میرے اکلوتے بیٹے نے میرے دوستوں
سے یہ راز معلوم کر لیا
اس نے ستیہ وتی کے باپ سے اپنے باپ
کے لیئے درخواست کی
ستیہ کے والد نے کہا تمہیں اپنے باپ کی
وراثت ترک کرنے کا حلف دینا ہوگا
بیٹے نے حلف دیا اور ماں کو گھر لے آیا
بوڑھے نے مرتے ہوئے بیٹے کو ور دیا کہ وہ
جب تک چاہے گا،
موت اس کا دروازہ نہیں کھٹکھٹائے گی

ایساوہ کہتے ہیں

ہر شخص کو اسکی چاہت کا پھل ملتا ہے
یوگی، یوگ کو، تیاگی، تیاگ کو اور
سنیاسی کو سنیاس پراپت ہوتے ہیں،
شاستروں کا نچوڑ،
وید، پوران، اپنشید ہیں، پوتر گیان ہیں
وہ اسی گیان کے بل پر
دیش سیوا میں اترا تھا
اسی کے سہارے اس نے بھنگی کالونی میں
بسر اوقات کرنے اور اپنے آپ کو
بھنگی کہلوانے میں کچھ عار محسوس نہیں کی
اس نے دل کی بے لگامی، کام، کرودھ
موہ، لوبھ اور اہنکار سے چھٹکارا پایا
اس کے فکروتردد دور ہوئے
رنج والم کافور ہوئے، آتما بلوان ہوئی
ایساوہ کہتے ہیں

بینر

دیوتاؤں نے بینر اٹھا رکھے ہیں
یوگیوں نے استھانوں پر
ماتھا ٹیکنا چھوڑ دیا ہے

طوق

ہم بے دست و پا مہمان کی طرح
ٹھہرے ہوئے ہیں، پھر بھی
اپنی ہمت و کوشش سے،
زمین کو آباد اور سرسبز رکھتے ہیں
یکتائے زمانہ کاریگرے درنو کی مدد سے
اندر پرست شہروں کی بنیاد رکھتے ہیں
شاندار اور خوبصورت شہر آباد کرتے ہیں
ایک ہی نمونے کی گلیاں، بازار اور چوک
بناتے ہیں
دھرم شالیں، مسجدیں، ہسپتال
اکھاڑے اور شوالے بناتے ہیں
طلسماتی نظارے قائم کرتے ہیں
دروازوں میں دیواروں کا دھوکا ہوتا ہے
خشک زمین پانی سے لبریز نظر آتی ہے
بے شمار سہولتوں کے اعلان ہوتے ہیں
سوداگر صنعت کار، کاریگر، دوکاندار
جوق در جوق، قسطوں پر، ان کو خرید کر
قرض کا طوق پہنتے ہیں
فصلوں کی زمینوں کو برباد کرنے میں
پورا ہاتھ بٹاتے ہیں

انیک پدارتھ

کس نے، اپنی پرکرتی مایا دوار،
سورج، چاند، اگنی، پرتھوی اور
آکاش بنایا
پھر انیک پدارتھ پیدا کئے
منشیہ کو چوراسی لاکھ، یُونیوں میں
افضل المخلوقات بنایا
منشیہ کے سوا
سب یونیاں بس، بھوگ یونی ہیں
مگر، منشیہ
بھوگ یونی کے سوا،
کرم یونی بھی ہے

شاہزادہ

ڈائنیں قطار اندر قطار
مشعلیں لئے ٹھہری ہیں
میں ان کا شاہزادہ ہوں
وہ مجھ سے محبت کرتی ہیں

بے حس ہونٹ

سارے کتوں نے
دِن کے مشاغل اور
رات کی مصروفیات
ترک کر دی ہیں
اب وہ مکینوں کے بستروں میں لیٹے
تکیوں پر سر مارتے ہیں
دور سے گانے کی آواز آتی ہے تو
سر کے بالوں کو درست کر لیتے ہیں
ساری کتیائیں، گردنوں سے گرے
آنچلوں کو کمر کے گرد لپیٹ لیتی ہیں
سارے جسم خوشی سے کانپتے ہیں، مگر
ان کے ہونٹ ابھی بھی بے حس ہیں

خوف کا گنبد

ان دیکھے کا خوف منڈلاتا ہے
ذہن پر ڈر کا گنبد لٹکتا ہے

طوفان

طوفان کی پیٹھ پر سوار
چھوکری،
بڑی ہاٹ ہے
اپنی چھینی ہوئی جاگیر
واپس لینے آئی ہے
اچانک وہ سنبھل کر بیٹھی
طوفان کی باگیں واپس موڑیں اور
چابک برسانے شروع کر دیے
اصطبل کے پاس پہنچ کر وہ رک گئی
مغرب میں سورج ڈوب رہا تھا

انگڑائی

میرے ماتھے کے پسینے نے،
ایک آگ پکڑ لی ہے،
میں اپنی تیز، سرخ، لپکتی زبان پھیلا کر
ادھر اُدھر دیکھتا ہوں
ایک عورت میری طرح انگڑائی لیکر
بھاری بدن سے لیٹ جاتی ہے
میں سارے ارادے توڑ کر
اس کی جانب رینگ لیتا ہوں

مضبوط جگہ

میں تمہارے پیروں سے باہر آنے کا

انتظار کر رہا ہوں

مجھے ڈر ہے تم اپنے ہی گھونسلے سے

یا پھر پیٹ خالی ہونے کی وجہ سے

کہیں جمہوریت سے باہر آ کر

ایک واجبی غصے کے ساتھ

ہلکاتے ہوئے

پیٹ کی طرف اشارہ کرتے

اپنی کوتیا سنانا نہ شروع کر دو

کیا تمہارے پاس کوئی مضبوط جگہ ہے

رسمیں

یہ دنیا اب گلوبل ویلیج ہے

سادھو، اصحاف کہف سے ملتے ہیں

ہنڈنیاں، ہمارے گھروں کی رونق ہیں

لال رومال

بھوک پیاس سے بدحال مخلوق

پنجوں کے بل کھڑی تھی

وہ بار بار مڑنا چاہتی تھی

اس کی ماں، مضطرب، ادھر ادھر

گردن ہلا کر، دائرے میں چلہ کاٹتے ہوئے

عبادت کے منتر پڑھ رہی تھی

ایسا لگتا تھا کسی گھسے پرانے لاؤڈ سپیکر سے

مستقل آوازیں ابھر رہی ہوں

اچانک ماں کے نتھنوں میں

خارش کا احساس ہوا

اس نے ناک سنکنے کے لیئے رومال اٹھایا

تو وہ لال سیال سے بھیگا تھا

کمپنی

میں نے ہوا کی ایک کمپنی خرید لی تھی

میری مٹی اس میں اڑ کر

بلندی پر تیرتی پھرتی تھی

میرے یاروں نے اک دن

ہمارے اوپر پانی پھینک کر

مجھے زمین پر اتار دیا

انگیا

میں نے بھی اپنی عمر میں
ہر لڑکی کی طرح انگیا پہننی شروع کی تھی
میرے اور انگیا کے درمیان ہمیشہ
ایک فاصلہ قائم رہتا تھا
جب درزی کا لڑکا ماں کے کپڑے لاتا تو
اسکی نظریں میرے کرتے کے اندر
جم کر بیٹھ جاتیں
میری سانس پھولنے لگتی اور
میرے اور انگیا کے درمیان کا فاصلہ
سمٹ جاتا

شرمندگی

میں دوبارہ ٹھنڈے
گوشت کے تجربے سے گذرا
اس نے میری شاہ رگ نہیں کاٹی
رگیں کاٹنے کو، چاقو تلوار کی
ضرورت نہیں پڑتی
شرمندگی کا جوہر، موت کے لیے
بھرپور وار کرتا ہے

حقارت کی نگاہ

وہ میرے ساتھ سوتی
میرے ساتھ جاگتی
پھر بھی میری روح کو
حقارت کی نگاہ سے دیکھتی
میں کہتا اپنے چہرے پر
ناگواری کے تاثرات مت آنے دو
تمہاری بدگمانیاں
تمہاری مسکراہٹ چھین لیتی ہیں
میں ٹھوکریں مار کر، اس کے
گالوں پر تھپڑ رسید کر کے بھی
اس کی نگاہ کا بدلہ نہ چکا پاتا
ایک رات اس کے سوتے ہوئے
میں نے ایک چھینی، ہتھوڑے سے
اس کے دل میں اتار دی

روشنی سے پہلے

بدقسمتی مجھے گھیر کر بھوتا نگ کے لامائی خاندان

میں لے گئی

کورجے میں، دس روز کے لیئے

سرندیپ بوندی کی سالانہ رسومات کی ادائیگی

ہمارے لیئے لازم کردی گئی

کنجور، سو جلدوں پر مشتمل تھی جس کی

ساری جلدوں کو سات دن میں ختم کرنا تھا

ورنہ گردن سر سے جدا کرنے کا حکم تھا،

ساتویں روز تک ہم یہ کام کر ہی نہ سکتے تھے،

کر بھی نہ سکے،

آٹھویں دن کی روشنی طلوع ہونے سے پہلے

ایک نامعلوم شخص نے دروازہ کھول کر ہمیں

روشنی پہلے دور نکل جانے کا کہا تھا

مایا جال

موہ مایا کے گرفتار لوگ

گیان پراپت کر کے

اپنی پہچان سے گذرتے

دنیاوی بندھنوں سے آزاد ہو جاتے ہیں

زندگی اور موت کے راز کو جان کر

محبت اور نفرت سے آزادی پاتے ہیں

اگر ایسا مقصود تھا تو منشیہ کی ایک ہی

صنف بنائی ہوتی

اپدیشوں کا جال کیوں پھیلایا

کلینزی

جیدے نے ٹرک کی کلینزی چھوڑ کر

سپاہی کی کلف دار وردی پہن لی

اس کے بچے بھوکے اور شیداں شہید کی بیوہ ہے

بغیر نمبر کے سیکٹر میں،

پانی میں بھیگی، نمک مرچ میں بسی،

رات کی تلی روٹی، مقام فیض ہے

نیک بستیاں، فاحشاؤں سے آباد ہوئیں

مادر پدر آزاد کشیاں،

برنیڈ ڈ، برا، پہنتی ہیں

برہمن

لکڑی، بکریاں چراتے، پتے توڑتے

ایک سانپ سے ڈسا گیا،

مر کر اس نے دکھ بھوگا اور آخر

ایک بیل بن کر، زندہ ہوا

بھکاری بیل پر سوار، بھیک مانگتا

کھونٹے سے باندھ کر، اس کی

خبر گیری نہ کرتا

کمزوری سے ایک دن وہ بازار میں گر گیا

اس کی جان اٹک گئی تھی

بہت سے لوگوں نے اسے اپنے

نیک کرموں کے پھل دیئے مگر

اس کے پران نہ چھوٹے

ایک روز ایک رنڈی آئی جس نے

اسے اپنے ست کرم کا پھل دیا

بیل کا شر پر چھوٹ گیا

اگلے جنم میں وہ گیانی برہمن ہوا تھا

اپنی چھاتیاں پیٹیں

پاؤں کے نیچے تپتی ریت

اوپر لہو چاٹتی ہوا،

آدمی صحرائی دریا میں غرقاب ہوئے

جلتے جسموں کی روشن لکیروں نے

دھوکا دہی کے ہجوم جھیلے،

فقط، اندیشوں کی تعبیر بن کر آئے

گرنے والی لاشیں، بے لوح تھیں

بے خانماں، اکیلوں کا دستہ

مٹی کے سینے پر یوں سویا کہ

پانی کے کشکولوں کی ضرورت باقی نہ رہی

کچھ مردود یزید، انہیں جینے کا

احساس دلاتے رہے، لیکن،

زندگی برق کی تیزی سے گذر گئی

آج بھی نیزوں پر ٹکے سر،

سڑکوں پر شور اور واویلا کرتے ہیں،

اپنی مسافتوں کی روداد سناتے ہیں

لکڑی کے تختوں پر بیٹھی نسل

سوچتی ہے، کیوں نہ وہ بھی،

بے گور و کفن لاشوں اور

نیند کا گھر.....

تمہار ہجانے والوں کے لیئے

اپنا سر، اپنی چھائیاں پیٹیں

پورے خانوادے کا سوگ بنائیں

ماتمی جلوس کا غم بانٹیں

سونے کی تھالی

جھینگوں کے خول کی مالا

مونگے کے پھولوں سے سجی

سونے کی تھالی میں رکھ دی گئی

ایک پہنچے ہوئے ستارا شناس نے

پانسہ پھینک کر

بدشگونی، پلٹ دی تھی

اب اس کا رخ میری جانب تھا

مجھے گھوڑے پر سوار ہو کر

مشرق کے رخ آنے والی کھائی میں

جان کا نذرانہ پیش کرنے کا حکم مل گیا

میرے لیئے ضروری تھا کہ جلدی سے پہلے

میں ایسی دو تھالیوں کا انتظام کرتا

عورت کی تعظیم

شاہ کو پیادے کے خانے میں رکھ دو

جس میں لیلیٰ کی جان ہے، اس کا تن

تلوار سے جدا کر دو،

کتابوں سے بھرے صندوق

پلیٹ فارم پر رکھے ہیں،

میں نے عمر بھر، چاند کو

پانی میں تیرتے نہیں دیکھا

میری مٹھی میں گیلی مٹی بھی ہوتو میں

نسوانی اعضا، بھینچنے کی کوشش کروں گا

سارا جہاں، ایک سر گشتہ جسم ہے

کرو موسوم کی ہجرت پر مامور لوگ

اس کے رتبہ عالی پر بھونکتے ہیں

موروثیت میں شامل اظہار

عورت کی تعظیم ہے،

مجھے ہسپتال میں، بڑھاپے کے لیے

ایسے جرثومے کی تلاش ہے، جو عورت بنا سکے

تازہ مہک

ستر قصبوں کے اس چھوٹے شہر میں
ایک ہی گھر کے طواف میں،
میری عمر گذر گئی
یہ کیسا سفر تھا، جو تیرے جانے کے بعد بھی
کبھی ختم نہیں ہوا
میرے اردگرد ہوا کا ایک جال تھا
جس نے کبھی مجھے اس شہر سے
نکلنے نہیں دیا،
اتنے سال تیرے بدن کی مہک
اس میں تازہ رہی،
بچھڑنے سے پہلے،
آخری بات میں تیرے ہیولے سے
گلے ملا تھا

مسافتیں

میری ساری پچھلی مسافتیں
جو میں نے تیری طلب میں طے کیں
دن کی روشنی میں بھٹکاتی رہیں،
میں نے رات کو سفر اختیار نہیں کیا کہ
میری طلب کہیں مجھے تم تک نہ پہنچا دے

مرادیں

پہلے پہل جب اس سے، میری محبت ٹھہری تھی
مجھے معلوم نہ تھا کہ وہ اپنے لہجے سے
کسی بھی دل میں سوراخ کر سکتا ہے،
اپنی نیلی آنکھوں کی رنگت بدلنے پر قادر ہے،
سرخ آنکھوں سے جلا کر راکھ کر سکتا ہے،
اس کے اعصاب لوہے سے بنے ہیں،
اس کے پاؤں سیدھے ہیں مگر الٹ سکتے ہیں
وہ جذبات میں بہہ گئے لمحوں میں بھی
کسی زندہ مرد کو ہیجڑے میں بدل سکتا ہے
اسکی پہلی کروٹ ہی سے میں حواس کھو کر
سڑکوں پر گم سم، مجذوب کی صورت پھرتا ہوں
لوگ مجھ سے مرادیں مانگنے آتے ہیں

متروک ندیا

کاش میں چٹانوں جتنا، مضبوط ہوتا
بارشوں اور اندھیروں سے
غار کے اندر پناہ لے سکتا
مگر میں تو ایک بہتی ندیا کی مانند ہوں
میں جب ڈوب جاؤں تو مجھے
متروک قرار دے دینا

غیر متحرک چیزوں کی دوستی

دِل کا شکرا، دیواریں توڑ کر اڑ جاتا ہے
زمین میں دبی، موت کی تاریں
تمام عمر ایک حادثے کا انتظار کرتی ہیں
کچھ پھول ایسے ہوتے ہیں جن کی خوشبو
کوٹ کی تہوں کو توڑ کر نکل جاتی ہے
قطرے کے اندر چھپی تصویر نکالنے کے لیے
ایک سوئی سے اس میں چھید کرنا پڑتا ہے
سارے سفر کی تھکن، بدن پہ مل کر
ہم پہلے پڑاؤ پر گر کر سو جائیں گے
یادوں کی درازری کو صرف خواب ہی کھینچ سکتے ہیں
الٹے لٹک گئے زمانوں سے دوستی کس کام کی
سارے دوست، ساری عمر ساتھ نہیں چلتے
زندگی کے ہر دور میں نئے دوست بنانے چاہئیں
کوئی تو ہو، جو تمہیں مرنے کے بعد روئے، یاد کرے
جھاڑیاں پاؤں جکڑتی ہیں، درخت گلے ملتے ہیں
جھیل کی ٹھنڈ سینے میں اتر جاتی ہے
چھوکریوں کا عشق تو فضول تھا، آیا اور آ کر گذر گیا
زمین کی غیر متحرک چیزیں زندگی بھر کی دوست ہیں
ان میں کتنی وفا ہے، تم میری عمر میں نجوبی جان لوگے

مرنے والے کی چتا

وہ جنگل میں گیا جہاں
بہار کی آمد آمد تھی
پتے، درخت، پھول سب
خوشی سے جھوم رہے تھے
چہچہاتے پرندوں کی ہیجان انگیز
حیوانی زندگی نے ماحول پر
قبضہ جما لیا تھا
وہ اس دلکش منظر کے سامنے
مبہوت ہو گیا، بے بس ہو گیا
اس ملاپ کے اختلاط میں،
وہیں گر کر مر گیا،
پرندوں نے ساری چہکار،
جنگلوں کے سپرد کی اور خود
مرنے والے کی چتا کے ساتھ جل مرے،

بولیاں

گلیوں، دروازوں کے اندر کہے لفظ
اپنی موت آپ مر گئے، نئے مکین
گئے وقتوں کی بولیاں سمجھنے سے قاصر ہیں

راجے، رانیاں

تیسرے پہر کی ہوا، کھنڈر پر
رینگ آتی ہے،
گھاس کی سرسراہٹ،
مکینوں کے بدنوں کو اکڑا دیتی ہے
سورج ان کے پپوٹوں میں،
روشنی کے دائرے بناتا ہے
باسی، اپنے جسموں کو پیچھے چھوڑتے ہوئے
ان کے آخری پڑاؤ کی طرف
کوچ کرتے ہیں،
سب کی رانیاں، اپنی اپنی اوڑھنیوں کو
چھاتیوں سے نیچے کھسکا کر،
اپنے راجاؤں کے پہلو میں
لیٹ جاتی ہیں

اکارس

میں اکارس کو بھول کر،
دور، کہیں اوپر نکل گیا
اس سے پہلے کہ سورج مجھے
جلا کر سمندر میں پھینک دیتا
مجھے بارشوں نے دھوڈالا

مرے ہوئے لوگوں کی فکر

مجھے معلوم نہیں،
میرے لیے، بھیک مانگ کر گذارا کرنا
بہتر ہے یا پھر ان سے لڑنا،
میں نہیں جانتا اس جنگ میں ہماری فتح ہوگی یا
ان کی جنہیں ہم مار کر زندہ رہنا چاہتے ہیں
میری عقل ماری جا چکی ہے،
اس وقت میرا مذہب کیا ہے، میں
اچھی طرح سمجھ نہیں سکتا،
کوئی مجھے اس تذبذب سے نکالے
کیا اس سرسبز روئے زمین کا میں،
اکیلا مالک بن جاؤں گا یا جنت میں
میرا راج قائم ہو جائیگا، پھر بھی
میرے جسم اور دل کو جلانے والا یہ رنج
کس طرح مجھ سے دور ہو سکے گا
اپنے بھائیوں کو مارنے کے غم سے
میری رہائی کیسے ہو سکے گی
اس نے ہنس کر کہا، احمق! پاگل لوگ
مرے ہوئے لوگوں کی فکر نہیں کرتے

شمع جلائے رکھنا

ہم کچھ نہ کچھ جلائے رکھتے ہیں

روشن رکھنا، ہمارا عزم ہے

ہم سڑے کوڑے کو جلاتے ہیں

زہر سے پاک کرتے ہیں

چند کیڑوں کو مارنے کے لیے

پورا بدن جلاتے ہیں

بے قصوروں کی لاشیں،

قلموں کی سیاہی سے ٹوٹ ٹوٹ کر گرتی ہیں

نئی روشنی کا انتظام کرتی ہیں

پھر ہم ان کی میتوں کی یاد میں،

سالہا سال روشنی کرتے ہیں

اپنی صلاحیتوں کے جوہر دکھانے کو

میلوں کا انتظام کرتے ہیں

دور نزدیک کی ریاستوں کے شہزادے بلا کر

مشعلیں روشن کرتے ہیں،

بھاشنوں کے کرتب دکھاتے ہیں

کرتب ہمارا نصب العین ہے

بجوکا

بہت ہو چکا، اب میں

درخت کی چھال پہننا چاہتا ہوں

سجدوں کے انعام میں،

چاول پانا، ہر وقت منت کرنا

بے اماں، آوارہ سیاروں کی طرح

مبہم اشاروں پر زندہ رہنا،

خودرو، بچھی گھاس پر سونا

قید خانے کی دیواروں پر

اپنے خون سے بے بیہودہ لفظ لکھنا

بند دروازوں کی درزوں والے صحنوں میں س

پہرے دار کی بندوق کی زد پر،

بے خوفی کی آرزو کرنا،

کیلوں والے بوٹوں کی آواز کی نوک پر جینا

پھٹے پرانے کپڑوں سے بنے

بجوکا کی طرح زمین میں گڑے رہنا

ہزاروں سال کی زندگی ایسے بسر کرنا

کچھ قیامت سے کم نہ تھا،

مہربانی فرما کر، مجھے اب درخت کی

چھال پر لکھا جائے اور میرے

زمانے میں بھیج دیا جائے

شور بیر

تمہیں دنیا بھر کے جیووٗں کا

رنج کرنا، مناسب نہیں

لڑائی تو کوشش کے بغیر ہی

ایک کھلا ہوا پھاٹک ہے

باپوں کے نام کو بٹہ لگانا

انہیں ہیجڑوں، بزدلوں کے ناموں سے

منسوب کرانا ہے،

شور بیروں کے لیے یہ دکھ کی بات ہے

دیوی

سنگ تراش نے نجمہ کی

ایک شاندار مورتی بنائی

میں نے سرخ زبان لگا کر

اسے دیوی میں بدل دیا

جس نے کالی ڈائن نہیں دیکھی وہ

میرے پوجا گھر آ سکتا ہے

تقسیم

اے پنڈت تیری پوتھی

اس تختی سے اچھی ہے

اس نے جو چیز چھپا کر رکھی ہے

تو قیاسوں میں ان کا کھوج کر لیتا ہے

میرا ہاتھ دیکھ، تاریخیں تقسیم کر،

میں کتنا حریص ہوں

تمام تر پابندیوں میں

ساری آفات کے ساتھ

مجھے زندگی پیاری ہے

چوری

نہر کے کنارے

درخت کی اوٹ میں،

میں کتاب لیئے بیٹھا تھا،

نوراں نے میرے سامنے،

نہر میں چھلانگ لگائی تھی

دودھیا بدن

کتاب سے

کتنا لذیذ ہوتا ہے

ہزیمت کا پردہ

کچلی ہوئی روحوں والے

وجودوں نے میرے اندر

نفرت اور گھن پیدا نہیں کی

پھر میں کسی

ہمدردانہ رویے کا

مطالبہ نہیں کرتا

ہزیمت پر پردہ ڈالنے سے

انسانیت کی توقیر میں

کوئی اضافہ نہیں ہوتا

رسائی

چائے کے کھوکھوں اور بس کے سٹینڈوں پر

صابن، سرمہ، کنگھیاں اور پاؤڈر والے

سٹوروں پر

ایک ناجائز بچے کی پیدائش کا چرچا ہے

انہیں اس بات سے دلچسپی نہیں کہ

بچے کا باپ کون تھا،

وہ چاہتے ہیں، اس بہادر عورت تک

ان کی رسائی ہو جائے

فرستادہ

خوف سے مبہوت، خاموش لڑکی کو

دیوتا نے اپنے بازوؤں میں لے لیا تھا

بہت دیر اس کو پیار کیا،

اختلاط سے ایک لڑکا پیدا ہوا جس نے

زرہ بکتر اور کانوں میں بالے پہنے تھے

بدنامی کے خوف سے، ماں نے بچے کو

ایک ٹوکری میں رکھ کر، دریا میں، بہا دیا

دریا کنارے ٹہلتی ایک رتھ بان کی بیوی نے

اسے دیوتا کا فرستادہ سمجھ کر، پکڑ لیا

خاوند نے کہا، ایک بددعا ہے جو مجھ کو

کبھی باپ بننے نہیں دے گی لیکن تم

ایک منفرد اور خوش نصیب

ماں بن سکتی ہو

منظر

پرندوں کے اڑتے ہی

درخت سائیں سائیں کرتے ہیں

سارا منظر اجاڑ ہو جاتا ہے

نیا دن

میں نے نئے دن کے ساتھ

ریت سے مٹھی بھر لی تھی

تمام دن یہ میرے ہاتھ سے

سرکتی رہی

سورج کے ڈوبنے کا منظر

لہو آمیز تھا

مٹھی خالی ہوئی

ایک اور دن مر گیا

میں نے دروازہ بند کر کے

آخری کرنوں کو باہر نکال دیا

موجود

ٹہلتے ہوئے، میں دور نکل گیا

سنگ تراش نے ہو بہو،

میری شکل کا مجسمہ بنایا تھا

یہ دنیا بھی عجائب گھر ہے،

میرے پہنچنے سے پہلے میں موجود تھا

گپت سودے

ہاتھوں پر رومال پڑے ہیں

انگلیاں قیمتوں کا تعین کرنے میں مصروف ہیں

بھاؤ تاؤ کرنے والے، گپت سودے کرتے ہیں

یہاں تجارت کے اصول طے نہیں

دلال، ان گنت، ننگی عورتوں کے بدن

ٹوہ کر، دبا کر دیکھتے ہیں

حسین جسموں میں انگلیاں چھونے سے

بدن پر گلابی گڑھے پڑ جاتے ہیں

سفیدی سے زردی اور پھر سرخی

تیزی سے دوڑ کر، مرکز فنا پر آتی ہے

نا قابل قبول عورتیں

شکست کا اعتراف کرتی ہیں

شرمندگی چہرے پر لیئے، ایک ہاتھ میں ازار

بند پکڑے

بغیر آواز، بغیر آنسو، روتی ہیں

بارٹر

گاجر پر لڑنے والی، رانی

ایک مولی پر مان گئی

مزدوری، نوکرانی،

ہم دونوں کی ضرورت ہے

نیند کا گھر

بتیاں بجھ گئیں،

خاموشی دیمک کے روپ میں،

جسموں میں اترنے لگی

دروازے کی چٹخنی لگانے والا شخص بھی

مدہم بجلی جلا کر، بستر پر لیٹ گیا

ہلکی روشنی میں، سفید چادر کا مکین

کفن میں لپٹی لاش دکھاتی دیتا ہے

تنہائی، تاریکی اور خاموشی کے خیال

بلندی سے گرتے ہوئے آدمی کے

جسم اور ذہن سن ہونے کی صورت ہیں

ایسے لمحے کچھ دیر زندہ رہنے کے بعد

مر جاتے ہیں، اور میں دھیرے دھیرے

اپنے جسم میں واپس آ جاتا ہوں،

شائد............!

کلینز

ٹرک کی چھت پر،

ترپال کے نیچے،

سوتے ہوئے اسے پتہ نہیں چلا،

وہ کب ڈوب کر مر گیا

لفظ

حرف کو کیا معلوم کہ وہ کہاں سے آیا ہے

تیرے دروازے پر ٹھہرے لمحے کو کیا پتہ

کس نے اسے گرفتار کر لیا ہے

بچوں کی پوری جماعت مر گئی، موت کو کیا خبر!

سُرخ گلابی انگوٹھیوں کے زندہ طلسم کا

کیا نام ہے

سورج دیکھنے کے عمل کا بیان کیونکر ہو

عمارتیں، کھنڈروں اور مزاروں میں بدلتی ہیں

اس ڈھلوان پر لڑھکنا کیا ہے

تودوں کے گرنے سے سڑکیں، کنوؤں میں

بدل جاتی ہیں،

بھوکوں کے گرد، جو موت کا ہالہ ہے،

زیست جب الٹائی جائے گی، تو

صدیوں کی اقدار دھماکے سے پھٹ پڑیں گی

ان دیکھے معنوں کا انبار لگا ہے

آفٹر ایفکٹ

بھگوان رام، جب سیتا کو
گھر سے نکال دے گا تو
اسے اپنا کام تو کرنا ہے،
وہ راون کے پاس رہ آئے گی
مہاستی سیتا کا جلوس،
باہر سے گذر گیا
اندر ہمارا کھیل بند ہو گیا

تیندولے والی

جب جب، پڑوسی ملک سے،
قیدیوں کی رہائی کا معاہدہ ہوا
ہم نے اپنی بڑی بوڑھیوں کے عوض
ان کی نوجوان، خوبرو، دوشیزائیں
آزاد کردیں،
بس ایک ہے جو اپنے
تیندولے چھپا رہی ہے

ہم شکل

میں اپنے گھر سے اپنا
ہمشکل تلاش کرنے نکلا تھا
لیکن میرے گیتوں میں کوئی معنی نہیں تھے
کمرے کی بے ترتیبی، کسی بھی عورت کے
رونگٹے کھڑے کرنے کو کافی تھی،
اس کی آنکھوں کے سرخ ڈوروں نے
اس کے چہرے کو خوفناک بنا رکھا ہے
وہ مجھے سمندر پار سے آیا کوئی آدمی سمجھتی ہے
بچے کی آواز میں ڈھیرے ڈھیرے دکھ کی لہریں
بڑھتی جاتی ہیں، اسے پتہ چل گیا ہے کہ
اسکی ماں مرگئی ہے، اگرچہ اسے کسی نے نہیں بتایا
اس کے رونے کی آواز مجھ سے کتنی ملتی جلتی ہے
سفید مرمریں بالوں والی نے باہیں پھیلا کر
گھومنے والی کرسی کھینچ لی ہے،
صاف دکھائی پڑتا ہے اس نے خضاب لگا رکھا ہے
اس کی باہیں ایسے لگتی ہیں جیسی کسی کی
برہنہ ٹانگیں ہوں،
میرا ہمشکل کیبن کے شیشوں سے دیکھتا ہے
سوچتا ہے اگر یہ اپنی ننگی ٹانگیں
میز پر پھیلائے تو.............

زندگی

جب وہ اسے لاجونتی کی بجائے،
لاجو کے نام سے پکارتا
وہ ایک ان جانی خوشی سے پاگل ہو جاتی
وہ سندرلال کو اپنی ساری کہانی کہہ ڈالنا چاہتی تھی
اتنا رونا چاہتی تھی کہ اس کے سب گناہ دھل جائیں
اس نے اچھی ساڑھیاں پہن کر، کبھی اسے
لبھانے کی کوشش نہیں کی،
اسے احساس تھا کہ وہ کسی وقت بھی، اپنے گھر
اپنے بیوی بچوں کے پاس لوٹ سکتا تھا
گھر سے نکال دیئے جانے کے بعد،
صدمے سے اس کا دماغ چل گیا تھا
شدید جذبات میں دھتکارے ہوئے لوگ
کبھی کبھار گھر کو لوٹ جاتے ہیں
اس نے آج ایسا ہی کیا
بازار سے مٹھائی کہ ایک ٹوکری خریدی
لاکر کارنس پر رکھی، لاجو کے پاؤں میں ماتھا ٹیکا
پھر اٹھ کر تیزی سے چلتا باہر نکل گیا،
اسے کسی قیمت پر منظور نہیں تھا کہ اسکا دس سالہ بچہ
ریڑھی لگائے، زندگی کو گھسیٹ رہا ہو،

جمے کی کیچڑ کی کہانیاں

میرے پاؤں کے نشانوں پر
ہزاروں پہیئے دھول اڑاتے گذر گئے
مگر ایک کانٹا ابھی تک
اس کی چھوٹی انگلی میں دبا ہے
اس کی نوک پر میرا DNA موجود ہے
میرے دانتوں کی درانتیاں دیکھ کر
سایہ بھی چھپ جاتا ہے،
اپنی ماں کے پیٹ میں لوٹ جاتا ہے،
زئیس کی بیٹی، تاریخ سے نکل کر
روزانہ سورج کو گالیاں بکتی ہے،
کالے کمرے کا مکین
اپنے آنسوؤں میں روٹھا بیٹھا ہے
جمے کیچڑ میں ابھی کچھ کہانیاں
برآمد ہونے کے وقت کا انتظار کرتی ہیں
کالے اکھر، بغیر تارکول کی سڑکوں پر
بھونکتے پھرتے ہیں

ضبط

ہوا کے جھونکے نے،

کھڑکی کا پٹ،

بھینچ دیا ہے،

گلاب کی مہک،

باہر نکل گئی ہے

سیڑھیوں پر بیٹھی

ایک لڑکی کی سسکیاں جاری ہیں

بچے کی آواز بھی کربناک ہے

دیوار سے ٹیک لگائے

نیند سے نڈھال آدمی

اپنے پپوٹوں کو شکست دے کر

جاگ گیا ہے،

بیوی کی لاش اور بلکتا بچہ

وہ ضبط نہیں کر پاتا

مردہ کہانیاں

الفاظ، خود کچھ بھی نہیں

بس اپنے معنی کی مہر

ثبت کر دیتے ہیں،

اسی لئے ان کہی باتیں،

مردہ کہانیوں کے سوا

کچھ بھی نہیں

لیس دار بوسے

اندھیرا، جبڑے کھولے،

کالی لمبی زبان نکالے،

پانی میں چھپائے پیدا کرتا

میرے ہونٹوں پر لیس دار بوسے لیتا ہے،

میں گھپ اندھیرے میں

بے بس،

انتظار کرتا ہوں،

کب اسکی زبان واپس لوٹے گی

کب اسکا گوشت ٹھنڈا ہوگا

صدارت

اپنی صلیبیں،

اپنے کندھوں پر اٹھائے

سوئے دار چلو

ہمارے یار مردم شناسی میں

بالکل کورے ہیں

جیسے لوگ، اپنی بیویوں کو بھی

آنکھ نہیں مار سکتے

سوکھا کھانے والے،

کبھی پریشانیاں پیدا نہیں کرتے

بھیڑوں کی گلہ بانی پر

کوئی مذاکرہ ہو تو

صدر مملکت صدارت کرتے ہیں

سنگباری

ہواؤں کی سنگباری کے شور نے

میرے کانوں کو موت کی نیند سلا دیا

وادیاں گونج میں جکڑی کھڑی ہیں

روشنیوں کے عکس

میرے استقبال کی روشنیوں کے عکس

پس دیوار پڑتے ہیں،

لگن کے سفید پانی میں،

چاند کے پاؤں اترتے ہی

سارا سیال نیلا پڑ جاتا ہے،

پر جوش خوشیاں ان میں ڈوب کر

خودکشی اختیار کر لیتی ہیں،

دم واپسیں میری آمد،

اثر کرنے والی نہیں،

پانی کے ساتھ بدن بھی

نیلا پڑتا جاتا ہے،

روشیوں کے عکس ہنستے ہیں

کیلیں

میں، دیواروں میں کیلیں

ٹھونک کر

تصویریں آویزاں کرتا ہوں

دیواریں ہنستی ہیں

کیلیں پار اترتی جاتی ہیں

دعا

دوست، احباب، رشتہ دار سب

اسے ٹاور آف سائیلنس پر رکھ گئے تھے

وہ بجلی کی کرسی اور زہر میں

اعتقاد نہیں رکھتے تھے

مگر ایسی طویل بیماری، جس سے نکلنے کی

ساری امیدیں دم توڑ دیں تو وہ

وہیں سے نہلا کر جیتے ہی دور لے جاتے تا کہ

وہ جدائی کا صدمہ سہنا وقت سے پہلے سیکھ جائے

خاکی برساتی میں بیٹھا آدمی دور سے

جدائی کا منظر دیکھ رہا تھا،

اس نے نیلے گنبدوں کے اوپر دیکھا

گدھ، لال آنکھیں بھڑکائے

انتظار میں تھے، محوِ پرواز تھے

وہ پھرتی سے نکلا اور مرتے ہوئے آدمی کے

پاس جا پہنچا، اسے الٹایا اور تیزی سے

استرا چلا دیا،

تھکن کو کھنڈر سے نکالنے پر

اس نے استرے والے کے حق میں دعا کی تھی

رنڈی بھگتی

رنڈی کا طوطا، صبح سویرے

گیتا کا پاٹھ کرتا ہے،

گو رنڈی سمجھتی کچھ نہیں،

لیکن سنتی ضرور ہے،

روز روز کی تکرار سے اس نے

کچھ مہمایاد کر لیئے ہیں جنہیں وہ

چلتے پھرتے دوہراتی ہے

رنڈیاں بھی، ایشور بھگتنیاں

بن سکتی ہیں

نانیاں

یہ حکیم بھی بڑے نامراد شئے ہیں

بڑھاپے کے آسیب سے بچنے کے لئے

مختلف ادویات اور طلاؤں کے ساتھ،

چوزوں کی یخنی تجویز کرتے ہیں،

مگر بابے، تھکے ماندے، دیوار سے ٹیک لگائے

پھیکی پھیکی آنکھوں سے، نانیوں کو

گھورتے رہتے ہیں

جن ماٹرادیوں کی کبھی گھگھی بندھی رہتی تھی

اب بڑھ بڑھ کے گالیاں دیتی ہیں

آوازیں، کمروں سے باہر پہنچاتی ہیں

نیند کے گھر

میرا دل چاہتا ہے
اس کے کمرے کی کچھ اینٹیں اکھاڑ کر
میں اسے سوتا دیکھوں
ایک شہوت انگیز منظر دیکھنے کی خواہش
دلفریب خواب مگر مکروہ عمل ہے
کسی لڑکی کو بے سدھ سوتا دیکھنے کے لئے
اس کے کمرے کی دیواروں کو ادھیڑنا
گناہ ضرب گناہ ہے
مجھے سیاہ سلیپر پہن کر،
سفید چادر لپیٹے، اپنی آرام گاہ تک
محدود رہنا چاہیے

ملاقات

پہلے مجھے کبھی خواب نظر نہیں آتے تھے
اب ایک عرصے سے مسلسل
گذر گئے لوگوں سے ملاقات رہتی ہے

وصل کا موسم

حسن دل افروز، درِ انجم پر
برا جمان ہو جا
تیرا رخ تاباں، ستاروں کے جھرمٹ میں
جامے سے باہر، خوشبوئیں بکھیرتا ہے
کسی کو حسن کی تاب نہیں کہ اس کی
تاب موج چنار سے آئی ہے
لوگ کہتے ہیں کہ وہ اڑ کر پہنچیں
تیری محفل میں،
رشک عمر و اختر کلیوں کے
جگر چاک کئے دیتے ہیں،
سانسوں کی دھیمی، ہلچل مچی ہے
وصل کا موسم، آن پہنچا ہے

گلبرگ

دیویاں کوٹھوں سے اتر کر
تھیٹروں میں آگئیں، اب
ان کا بسیرا گل برگ ہے

عورتیں کہاں جائیں

تم امن کے کپڑے کیوں نہیں پہنتے

مٹی کو کیا حق ہے کہ بخل کرے،

جس کی کوئی رائے نہیں ہوتی،

عقلمندی کو بھی فقیر کر دیتا ہے،

تمہارا ذکر تو بس زبانی یاد رہے گا

تم نے عاجز اور ذلیل حصہ پایا ہے

صبح کی آمد تو اجتماع کے لیئے تھی

تم نے مگر

شام کی کھلی ہوئی پراگندگی چنی

عورتیں کہاں جائیں،

ان کے لیئے تو قبر ہی، قلعہ ہے

انتقام

بدروحوں اور کالی بلاؤں سے باتیں نہ کرو

اگر کوئی سن لے تو وہ انتقام لیتی ہیں

سمجھ

لڑکیاں، لڑکے، محبت

سب الّو کے پٹھے ہیں،

بڑی دیر سے سمجھ میں آتا ہے

اپنے رنج تہہ کر کے رکھ دو

اب کیا کرو گے،

میں نے پرانے کپڑے اتار کر،

نئے کپڑے پہن لیئے ہیں

میری روح کو نہ کوئی ہتھیار کاٹ سکتا ہے

نہ آگ جلا سکتی ہے نہ پانی گلا سکتا ہے

نہ یہ کاٹی جا سکتی ہے، نہ جلائی جا سکتی ہے

نہ بھگوئی جا سکتی ہے، نہ سکھائی جا سکتی ہے

ہوا کو بھی ممکن نہیں۔ تم بس

اب میرا تصور باندھ سکتے ہو، تمہیں

اپنے رنج اب تہہ کر کے رکھ دینے چاہئیں

اس وقت تک کہ جب

نظر نہ آنے والے، دوبارہ نظر آنے والے

بن سکیں گے

خواب

میں نے دیکھا، چاند

چوکور ہو گیا ہے

آؤ کمرے میں چلیں

جیون بوٹی

بوڑھی مائی ایک گداگر کی لجاجت سے
چائے کا سوال کرتی رہی،
ہونٹوں پر سفیدی جھلکتی تھی
کھنڈر کے پاس والا کتا
جیون بوٹی ڈھونڈ رہا تھا،
پنجوں کے بل چلنے والے جھینگر نے،
چتوں میں، ایک بھونڈی آواز پیدا کر دی
سورہ اخلاص پڑھو، یٰسین پڑھو،
مائی جاتی ہے،
نیم وا آنکھوں کی سفیدی بڑھتی گئی
زرد کتا، رو رو کر تھک گیا،
میری چٹائی پر ہی سو گیا،
پھر رات بھر ہم لڑتے رہے
صبح دم بڑھیا سدھار گئی

منڈی

ویگاس کی سڑکوں پر
چھوٹی تصویروں کی منڈی ہے

مچھلی کی مہک

دریا کے اوپر سے گذرتے ہوئے
کسی نے اپنا تخم نیچے پھینک دیا تھا
مجھے پتہ ہے تم، مچھلی کے بطن میں
کس طرح داخل ہوئی تھیں
تمہاری پیدائش پر، ماہی گیر نے،
تمہیں اپنا لیا تھا
مچھلی کی مہک، تمہارے جسم سے
اب تک چمٹی ہوئی ہے،
میری جادوئی طاقتوں سے
تمہارے بدن سے، یہ بُو جاتی رہے گی
تم ایک دائمی خوشبو کے ساتھ
میری شخصیت کا حصہ بنو گی

برینڈڈ

نیک بستیاں،
فاحشاؤں سے آباد ہوئیں
مادر پدر آزاد کشیاں
برینڈڈ برا پہنتی ہیں

آدمی کی موت

یہاں کتے بازی لے گئے ہیں
بلیوں کو استثنا حاصل ہے
چوہے معصوموں کے چہرے کترتے ہیں
جنگلوں میں دہشت، گلیوں میں
وحشت بڑھ گئی ہے
بہت جلد ایک اور قتل ہوانے والا ہے
گوشت پوشت کے انسان، ایک
کارپوریٹ رشوتی یونٹ کا ایندھن ہیں
ان کی روحانی قدر و قیمت کو
ویلیو ایڈڈ ضرب تقسیم سے
روپے، ڈالر یا پاؤنڈ میں بدلا جاتا ہے
ٹارگٹ کلنگ اب سرخی نہیں بنتی
بڑے قتل پر اوس پڑ چکی ہے
برف کی دبیز تہہ میں لاشیں گم ہو گئی ہیں
ازخود انصاف مہیا کرنے والوں اور
مقتدر گروہوں کا اپنا دینی نظام ہے
لوگوں کے لیئے انگریزوں کی کتاب
وقف کر دی گئی ہے
اشرف المخلوقات کی تذلیل اور
تحقیر جاری ہے،
وہ مقدس کتوں اور بچھڑوں کے
گوشت پر پالے جاتے ہیں
گلیوں، بازاروں اور مکانوں تک
عفریت کی رسائی ہے، جو
مرضی کا شکار کرتا ہے،
ایک گدی نشین پیر کا حکم ہے کہ
بھاگ سکے تو بھاگ ورنہ
آدمی کی موت مارا جائے گا

خواجہ غلام فرید

کوئی بھول گیا مقصد آنے کا
کوئی چلا مقصد حل کر کے
یہاں ہر کوئی فرید مسافر ہے
کوئی آج چلا کوئی کل چلا
کوئی بنا رونق جونپڑوں کی
کوئی محل چھوڑ کے رخصت ہوا
کوئی پلا ناز و نخروں میں
کوئی گرم ریت کے تھل چلا

کہنگی، برہنگی

میری برہنگی کو سرعام اچھالا جا رہا ہے
تقدس کا تصور ناپید ہو چکا
میں اپنے ارزاں قدموں پر،
کمر دوہری کیے اژدھام کی نمائش کا حصہ ہوں
میرے جوڑ کھل چکے، ان کا گودا،
بہہ نکلا ہے،
بڑھاپے نے میرے بال پہلے سفید
پھر سرخ کر دیے ہیں
چہرے پر پیلا عارضہ بہہ نکلا ہے
میرے بدن کی کھال، دھیرے دھیرے
اترتی جاتی ہے،
میری پسلیاں کہیں اندر کہیں باہر
دکھائی دیتی ہیں
میری چھاتی پہ بنے رنگین نقش لیر لیر ہو گئے ہیں
یہ جو سارے تماشا دیکھنے پر لگے ہیں
میری اوٹ میں کتوں کی ماؤں نے
انہیں ننگا، جنم دیا
میں نے انہیں، دنیا سے بچا کر
پردہ وحیا کا زیور اوڑھایا
اب جبکہ میرے پاؤں قبر میں اتر چکے ہیں،
یہ مجھے برہنہ پا کر
میری کہنگی کو حیرت سے دیکھتے ہیں

سفر

سرمئی ریت سے اڑ کر، کونج، چاند کی چاہ میں
لمبی اڑان بھر گئی،
نپنسک گولا، ہنسا ہے کہ اسے کبھی
امتحان سے گزرنا نہیں پڑے گا
ننگی عورتوں کے ٹولے، روشنی میں،
ڈھولک کی تھاپ پر، قطار میں کھڑے
سیاہ فاموں میں فاسفورس، بھرتے ہیں
لان میں بیٹھے آدمی نے، کمبل اوڑھ کر
تازہ غزل لکھ ڈالی،
سمندر کی چھاتیاں ابل ابل کر
ملاپ کی چاہت میں پاگل ہیں،
جنگلوں کی چڑیلیں، شہروں میں نکل آئی ہیں
ان کے لمبے دانتوں کی پیاس بجھانے کو
آج کی رات لمبی لائن۔ لگنے والی ہے

سوچ کا مرثیہ

سورج کے پاؤں میں چھالے پڑ گئے تھے
وہ اپنی سیاہ قبر میں، پاؤں لٹکائے بیٹھا تھا
مصنوعی دنیا کے سارے ہنر
گندگی کے ڈھیر پر لیٹ گئے،
پرندوں نے یٰسین پڑھتے ہوئے
اس کے شباب کا مرثیہ لکھا
پہاڑ کی اوٹ میں، جہاں وہ
لیٹنے جا رہا تھا، کچھ سیاہ بادل
دھاڑیں مارتے، پھوٹ پھوٹ کر رو پڑے
سارا باغ، ایک طلسم کدہ میں بدل گیا
ایک دور رس حیرت کی صورت
سرسراہٹیں، گردنوں میں اترتی جاتی ہیں

لکیر

میری ہتھیلی سے
اپنا خوف اٹھا کر لے جاؤ
تمہاری لکیروں میں یہی لکھا ہے

نئے آہنگ

کون کہتا ہے شاعری کی آب وتاب میں
شدت اور توانائی کا فقدان ہے،
ہماری نظمیں اردو شاعری کا نیا موڑ ہیں،
پرانے ڈھنگ، وضع قطع کا شکار ہو کر
ارسطو کے زمانے میں زندہ ہیں،
ان کے موضوعات تنگ اور بیان تکرار ہے،
ہمارے نوجوان اور نثری نظمیں، وزن سے
عاری ہو کر بھی
شاعری کے میدان کے تازہ کھلے پھول ہیں
ہمارے بابوں نے ترکی ٹوپی ترک کر کے
جین اور جیکٹ تو پہن لی
مگر اپنا اندر کو بدلنے کو تیار نہیں
نئے جنم لیتے آہنگوں سے فارغ ہیں

جلد

تم ان عزیزوں کے جانے کا
زیادہ غم نہ کرو،
جلدی ہی یہ کسی جنم میں،
تم سے آن ملنے والے ہیں

پرائز بانڈ

رات کے تیسرے پہر،

خواب میں میرے سامنے سے

ایک کالی بلی گذر گئی

میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا

میرے پاؤں کی چپل کے پاس

دو سرخ، آنکھیں مجھے گھورتی تھیں

میں نے لائٹ جلائی تو وہاں

کچھ بھی نہیں تھا،

اگلی صبح اخبار میں،

میرے بانڈ پر انعام نکلا تھا

اپائے

سادھو نے کہا، یہ بھگوان کے

مکھ واکر ہیں، جن پر چل کر

تمہارا کلیان ہوگا۔

اس کے پاٹھ سننے سے

جنم مرن کے بندھن ٹوٹ جاتے ہیں

ایک پہاڑی گھپا میں لکھا تھا،

چنڈال کا کوئی اپائے نہیں

تلاش

سفید، فیروزی لباس میں لپٹا

ایک عورت کا ہیولا

کوئی بھٹکی ہوئی آتما ہے

اماوس کی راتوں میں وہ

شہر کے سناٹے سے نکل کر

جیل روڈ پر پھرتی ہے

اس رات اسے دیکھنے والا

اگلے روز، دماغی خلل کے وارڈ میں ملتا ہے

ہسپتال کے سامنے، گورا قبرستان لیٹا ہے

اس وارڈ میں آنے سے پہلے

میں نے اس سے پوچھا تھا،

تمہیں کس کی تلاش ہے،

کہتی تھی،

ٹاور آف سائیلنس کہاں ہے؟

ترقی

جیدے نے ٹرک کی کلینزی چھوڑ کر

سپاہی کی کلف دار وردی پہن لی،

اس کے بچے بھوکے اور شیداں،

شہید کی بیوہ ہے

نیا گیان

سورج کے کناروں سے پھیلتی سرسراہٹ
بیزاری سے چمکتے پتھروں پر گر کر
ان کی تھکاوٹ کو دھیرے دھیرے پی رہی تھی،
کوچوانوں کے ہاتھ، محض
چابک کو ٹنے کے لئے بنے تھے،
ان پر کڑا وقت آ گیا تھا،
بچے جب دودھ کے لیئے بلبلاتے تو وہ
بہت دکھی ہوتے
رشیوں کا تصور کرنے والے، پہلے ان کی رغبت
دل میں پاتے، خواہش کے مرنے پر،
ان کی عقلیں ماری جاتیں
خلوت نے ان کے کانوں میں یہ بات
پھونک دی
پتھروں سے دست برداری کا اعلان کرو
فریب خوف و ہراس سے چھٹکارا پاؤ
سورج ہمارا بادشاہ ہے، اس سے گفتگو کی
ایک خفیہ زبان ایجاد کرو،
ستاروں سے سمتیں متعین کرو،
دیکھو، چاند، درختوں کے اوپر اٹھ آیا ہے،
اس نے پتھروں اور سورج کو
اپنی مبہوت کرنے والی روشنی میں
جکڑ لیا ہے
شاخیں جھک کر نیچے آ گئی ہیں، رسیاں
لٹکتی دکھائی پڑتی ہیں۔
سارے کوچوان ٹکا ہیں چاند پر جما کر،
ایک ایک رسی سے جھول جائیں
پرانی سلوں کے قیمتی لفظ، دھبوں میں بدل گئے
ماہر، گئے وقتوں کی زبان پڑھنے سے عاجز ہیں

آتمائیں

بڑا پھاٹک کھلتے ہی،
آس پاس کی جھاڑیوں سے نکل کر،
سرتاپا، سیاہ لباس میں ملبوس سائے
ایک دوسرے کو دھکیلتے، اندر داخل ہونے لگے
آنکھوں کی جگہ، دو سوراخ موجود تھے
ان سے چھلکتی ویرانی، پلٹ کر دیکھتی تھی،
سامنے، چھوٹے میدان کے درمیان میں
آگ کا ایک الاؤ روشن رہا تھا،
سیاہ آتمائیں، ان کا طوائف کر کے،
پچھلے دروازے سے،
دھلی دھلائی نکل رہی تھیں

شہتوت ڈالی کی لڑکیاں

پتلی سی، شہتوت کی ڈالی جیسی
نازک سی لڑکی کا رنگ
دھوپ سے سنولا گیا ہے
اس کا اضطراب
شبنم کے قطرے جیسا ہے
رات بھر چوکیداری کرنے والے کتے
صبح کو تندوروں میں سر دیئے ملتے ہیں،
کچھ دھنیں ایسی ہوتی ہیں جن کے بول نہیں ہوتے
پھر بھی انہیں گنگنایا جاتا ہے
مغویہ عورتوں کو ان کے شوہر، بہن بھائی
پہچاننے سے انکار کر دیتے ہیں، لیکن
وہ بزدل ہیں، مر نہیں سکتیں

ایڑھیاں

لفٹین، وندناتے مارچ کرتے ہیں
سلوٹ سے کپتانوں کی ایڑیاں اکھڑ گئیں
زمین نے انتقاماً، ان کی عقل چھین لی

یاد

یہ کیا ہے
یہ منظر تو آنکھوں سے باہر ہے
لُو کی تصویر، ہوا پر کشیدہ ہے
پھول کے اندر سے برآمد ہوتا نغمہ
ایک تماشاء جو ہر ہے
ہوا، ہاتھ میں تلوار لئے پھرتی ہے
کھلے پانیوں میں خوف ابلتا ہے
خالی بوروں میں، دہشت قید ہے،
تابوت تنہائی اوڑھے لیٹے ہیں
ہمارے کندھوں پر بیٹھے،
تیرے جادو کے مارے،
ہماری ہی چغلیاں لکھتے ہیں،
ان سے ہماری صلح کا،
جلد کوئی امکان نہیں،
جب کچھ دن گذر جائیں گے
یہ زمانہ یاد بن جائے گا، تو
ہم، تم، اسے یاد کر کے
ہنسا کریں گے

لاٹمنٹ لیٹر

جو ہڑ کے ایک ہی جگہ ٹھہرے پانی کی مانند
اپاہجوں کی آواز میں
ایک گمبھیرتا ہوتی ہے

مردہ پتوں کی طرح، مردہ پیروں میں
جرابیں، زندہ لہو نہیں دوڑا سکتیں
مٹی کے گولے بناتے وقت، ان سے کچھ
پوچھا نہیں جاتا

اسکی جیب میں ایک الاٹمنٹ لیٹر ہے
جو آج ہی ایک فرشتہ اُسے دے گیا ہے
مگر اس کا نگران ایک کوہ تن دیو ہے جو
اُس لکھے حکم کے مطابق
شہر سے بڑے مکان میں بٹھا کر
سارے جہان میں ننگا کر گیا ہے

زندگی

ہر صبح، سورج مجھے کوڑے لگاتا ہے
ہر شام مجھے، اُبلا چاند کھانے کو ملتا ہے

بُو

ٹرین سے اترتے ہوئے،
تم نے ایک ٹانگ کٹوا ڈالی تھی،
میں محبت میں اس ٹانگ کو اٹھا کر
اپنے گھر لے آیا تھا،
مہینوں میں نے اس کے تعفن کا
سامنا کیا، اسے سہنا سیکھا،
رفتہ رفتہ وہ ایک ہڈی میں بدل گئی
اسکی بو ابھی تک میری سانسوں میں بسی ہے،
مجھے اب تم سے محبت نہیں رہی
میں اس بو سے زیادہ پیار کرتا ہوں
جو برسوں سے میرا ساتھ دے رہی ہے

کچی مٹی

دریا کی تہہ سے، کچی مٹی نکال
مجھے وہ گھڑا پھر سے بنانا ہے
جب بھی خیال آتا ہے میرا دل
زار زار روتا ہے
کچی مٹی کا گھڑا اور عشق بے حساب
نگل لیا اس غریب ناپائیدار کو
مجھے اس کی مٹی واپس چاہیے
اسبار میں سوہنی کو ڈوبنے نہیں دوں گا

عمل

کبھی کبھی تھوڑا سا عمل،

کسی بھاری خوف سے بچا دیتا ہے

یوک مارگ میں کسی قسم کا خطرہ نہیں ہوتا

استروں اور منتروں کا مظاہرہ کرنے والے،

ایک تیر کے ساتھ آگ پیدا کر لیتے ہیں،

رتھ پر سوار، غائب ہو کر، پیدل چل پڑا ہے،

بہت مشاق اور سریع الاثر ہے،

سروں پر معلق رہ کر، ہوا میں تیرتے ہوئے،

اپنی حیرت انگیز مستعدی سے،

ایک بیل کے سر میں

بیس تیر اتار دیتا ہے

میں اسکی پیٹھ پر تھپکی دینے کے لیے کھڑا ہوں

انتقال

ایک طالب علم نے کہا

کاش ایسا اعلان

مسجد میں ہو کبھی

حضرات!

امتحانات انتقال کر گئے ہیں

کوئی نہیں

فرش غبار سے اٹا

چارپائی جھلنگا

دروازہ شکستہ

دیواریں جالا زدہ،

بدن میں بد ہیتی

روح جمال میں گم

مجسم

تقدیر مجسم مائل

اژدھا، بدن، سکیڑتا

سرقہ بالجبر، ماتھے پر سجائے

نکل آیا،

سارا کھنڈر دہشت کھو کر،

کافور سے مہک اٹھا،

ایک گھر میں بچی دوسرے میں ایک بچہ

بلکتے ہیں،

چُپ کرانے والا کوئی نہیں

حکم

کتے کی پچھلی ٹانگیں،

شہر میں رہ گئی ہیں،

وہ اگلی ٹانگوں سے میری چٹائی پر

پاؤں پسارے بیٹھا ہے،

میرا کٹا ہوا بازو، فرشتے کے ہاتھ میں ہے

میں اس کے ساتھ جانا نہیں چاہتا

اپنی داڑھی میں عقل کریدتا ہوں

میری چیخم دھاڑ پر، وہ بوچڑ بن گیا ہے

میں کہتا ہوں مجھے پچھلی ٹانگوں پر جانے دو

وہ کہتا ہے، تمہیں ٹھنڈے بکس میں رکھنے کا

انتظام ہو چکا ہے

بونے

سارے لمبی عقل والے، بال بڑھائے

زمین پر ہیں، بونے تخت پر بیٹھے ہیں

سیاہ تصویر

میں ایک فوٹو گرافر ہوں،

قبر میں لیٹے لوگوں کی تصویریں بناتا ہوں

میں نے اکثر، قبرستانوں میں،

خدا کی بھیجی ہوئی ڈراونی مخلوق کو

ان کے گرد ناچتے دیکھا ہے،

جنات اپنی سرخ آنکھوں سے،

انہیں دوزخ کا مزا چکھاتے ہیں،

پیپ سے بھرے سانپ، ان کے مونہوں سے

داخل ہو کر، پار نکل جاتے ہیں،

مردے چیخ چیخ کر توبہ توبہ کا شو مچاتے ہیں

روحیں کہتی ہیں یہ تو ریہرسل ہے،

ترازو کا امتحان تو ابھی باقی ہے

میرے کمرے میں ایک سیاہ تصویر لگی ہے

جس میں ایک چڑیل الٹی لٹکتی ہے

مگر کسی کو نظر نہیں آتی

بچوں کے نام

خودکلامی کے لیئے، ایک کمرہ

کتنا اچھا ہوتا ہے

بڈھے، اس عمر میں پہنچ کر

اپنے لیئے ایک جوان عورت مانگتے ہیں

ان کے جسم، برف کی سلوں کی مانند

یخ ہو چکے ہوتے ہیں،

بدن تھر تھر کانپتے ہیں، لیکن، ان کی

بانہوں کے ایک گھیرے میں،

حرارت منتقل کرنے کے عوض، وہ

شریعت کے تمام قانون توڑ کر،

زندگی بھر کی کمائی، اس کی جھولی میں

ڈال سکتے ہیں،

احساس

میرا احساس کئی روز تک

میرے ہونٹوں پر ٹھہرا رہتا ہے

پھر کہیں جا کر نظم بنتی ہے

ذلیل لوگ

یہاں عجیب و غریب، تر و تازہ گھاس

پھیلی ہے، اس کی سبزی،

میری آنکھوں کا نور چھن لیتی ہے

میرا بدن، میرے دل کا مطیع ہے

قلب میں یارانِ بد کی محبت جمی ہے

یہ میرے اندر جڑ پکڑ کر، ترقی کر گئی ہے

میں اس بات سے نہیں ڈرتا کہ

استاد مجھ سے درس کو نہ لے لے

میری روشن پیشانی کو دیکھ لو،

میں یاروں پر مکر و حیلہ کا جھنڈا نہیں گاڑتا

جب لوگ جبر پر کودتے ہیں، میں

اپنی نفرت کو ایک طرف رکھ دیتا ہوں

دوستو، میرے دل کی زمین،

خلل پذیر ہونے والی ہے،

میرے بعد یہ اجڑ جائے گی

ذلیل لوگوں کو چاہیئے کہ وہ اپنے طعنے

واپس لے لیں

تلاشی

مخالف جنس، ایک نوجوان کو،
'دریافت' کے سحر میں مبتلا کر دیتی ہے،
جہاندیدہ، کہن سالہ لوگ،
اپنے ننگے بدن اور جھریوں بھرے ماتھے
کے ساتھ
اس ارادے کی مذمت کرتے ہیں،
روایت کے ساتھ جڑے رہ کر بھی
ان کی وابستگی مغربی نغموں کے ساتھ رہی
سحر اور کشش تو بغاوت کی پہلی سیڑھی ہے
مائیں زمین پر بیٹھے بیٹھے، شہادت کی انگلی
اٹھا کر، ماتھے کی تیوریاں دکھاتی ہیں،
بڑے پروں والی چمگادڑیں، اپنی
بھاری پھڑ پھڑاہٹوں کے ساتھ
سیاہ رات میں
گردش کرتی ہیں
لونڈا، آدھی رات کے بعد، بند کمرے میں
کرسی پر بیٹھا، پلے بوائے، دیکھتا ہے،
اپنا آئیڈیل تلاش کرتا ہے

زیرک

میں اپنی زیرکی اور عقل سے کام لے کر
کسی بلند پہاڑ پر چڑھ جاؤں گا
دوستو تم اس زیرکی کو آگ دو،
تم رہزنی کے ہزاروں طریق سے واقف ہو
ہاتھ کاٹنے والی عورتیں، بیوقوف تھیں
عشقِ دوست میں عقل کو قربان کیا،
ناقص کو فنا کر کے، کامل کیا جا سکتا ہے
اگر عقل جاتی رہتی تو ہر ہر بال عشق ہو جاتا
میں نا سمجھ تھا، عشق میں نہیں پڑا،
بھاگ کر چوٹی پر جا بیٹھا
دوستو، تم اس زیرکی کو آگ دو

کارنس

کچھ رنگیں تصویریں، کارنس پہ سجی ہیں
سب کی سب، زندگی سے،
سانس سے عاری ہیں

خصلت

جن کے پاس ہتھیار ہیں،
عقل نہیں ہے،
ان کے ہاتھ باندھ دو،
ورنہ وہ سینکڑوں کو گزند پہنچاتے رہیں گے
ان کی رائے کو آگ لگا دو،
جاہل منصب کو رسوا کرتے ہیں،
سارا جنگل سانپوں، بچھوؤں سے بھرا ہے
جو خصلت دبی پڑی تھی،
آج چاروں طرف اسکا ظہور ہے
قلم غدار کے ہاتھ میں ہو تو
منصور دار پر کھینچ دیئے جاتے ہیں
حکم جب کسی گمراہ کے ہاتھ میں پڑ جائے
لوگ اس کو جاہ سمجھتے ہیں

چو بچہ

میں نے ایک چو بچہ بنایا ہے، جس میں
میری بچہ نظمیں تیرتی ہیں، خوش ہیں

خوشگوار تبدیلی

نحیف اور سوکھے ہونٹ
کھلتے ہیں، بند ہوتے ہیں،
غیر دریافت شدہ اشیاء
لحاتی اتار چڑھاؤ وقتی ابال ہوتی ہیں
کم عمر بیوی، بوڑھے آدمی کا
زیادہ دیر ساتھ نہیں دے سکتی
میری نبض کی جواں جنبشوں کو محسوس کرو
فطرت میری مددگار ہے،
نئی دریافت سوکھے ہونٹوں کی
مایوسیت کو بے تکلفی میں بدل دیتی ہے

مستقل ماتم

کوئی میرے دماغ میں،
اپنا جنازہ رکھ گیا ہے،
وہ میرے استغراق کا
مستقل رکن ہے،
ایک مستقل ماتم ہے۔

ہجرت

اس بار ہم،
چوتھی ہجرت کرنے والے ہیں،
تیسری بار ہم، پہاڑوں میں
چن چن کر قتل کیے گئے
دوسری بار، لسانی بنیادوں پر
زندگی تنگ کر دی گئی
اب ہمیں، ترقی سے محروم
رکھے جانے والوں سے خطرہ ہے
میرے ابو کی ڈائری میں لکھا ہے،
ہمارا پہلا سفر، اگست میں شروع ہوا تھا،
اب پھر اگست آنے والا ہے،
کیا کوئی ہمیں،
اپنے آباؤ اجداد کے ساتھ
دفن ہونے کا
پرامن راستہ دے سکتا ہے
امن کی آشا کے لیئے

بڈھا کنواں

جسم پر ماس بوٹی، نام کو نہیں
گڑھوں والی، آنکھوں میں وحشت
ہڈیوں پر منڈھی جلد،
بدن کی اناٹومی ظاہر کرتی ہے
استخوانی انگلیاں، مجھے
کندھے سے پکڑ کر جھنجھورتی ہیں،
ہر طرف وحشت کا راج ہے،
سُرخ چیونٹیوں نے جیسے،
آم کی چھت پر پناہ لے رکھی ہے،
وہ کاٹ کر اندھا بہرہ کر سکتی ہیں،
منہ کو پھلا کر کُپا بنا سکتی ہیں،
کمرے کا فرش، ایک دھماکے سے پھٹ گیا ہے
بڈھا کنواں، ایک چھجے سے لٹکا ہے،
گدلے پانی میں کچھ بلبلے بنتے ہیں
اور بس

ماورائی زندگی

بغیر آواز، غیر محسوس سانس لینے والا،
اضطراب اور خاموشی کے جامد لمحوں میں
جسم کی قید سے آزاد ہو کر،
خدا کے ارد گرد پھیلی
ماورائی زندگی میں
داخل ہو گیا
آج کا مکالمہ،
''جبریت'' کے حوالے سے ہے
اسکی تنہائی کو خدا کی موجودگی نے
سکون سے لبریز نہیں کیا،

فاصلے

سانس کی واردات
منظروں کو پلٹ دیتی ہے
جب یہ آتی ہے تو ایک ردھم ساتھ لاتی ہے
جاتی ہے تو اک دھڑکن لوٹ لیتی ہے
ہمارے درمیان فاصلہ اور بڑھ جاتا ہے
میتوں کا جنگل،
ایک اور درخت اگنے کا انتظار کرتا ہے

بدلتا محبوب

جس وقت میں نے چکور پر تیر چلایا
وہ عین سورج کے سامنے تھا
وہ تو سامنے سے ہٹ گیا مگر تیر
چاند کے سینے میں جا لگا
چاند اس دکھ میں، اپنے سیاہ و سفید
گھوڑے پر سوار ہو کر، آجتک مجھے ڈھونڈتا ہے
وہ دن رات میرا تعاقب کرتا ہے،
کہتا ہے اگر میرے محبوب کا دشمن نہ ملا تو وہ
گھوڑا ہی کاٹ کر پھینک دے گا
آخر وہ یہ کام کر گذرا، اب یہ گھوڑا
منگولیا کی سرحدوں پر دھکے کھاتا پھرتا ہے،
اس کی اگلی دونوں ٹانگیں چھوٹی ہیں
کہتے ہیں کہ چکور نے اب گھوڑے کا طواف
شروع کر دیا ہے،
وہ خوفزدہ پیلے چاند سے کہتا ہے،
تم میں ہمت ہے تو مجھ کو پکڑ لو

بدحالیاں

ایک لمحہ وحشت کا، میرے سر پر ٹھیر گیا ہے
زود فراموش، چھٹکارا کیسے ہوگا،
گلِ آئندہ، بہار کی آرزو نے
میرے ماتھے پر، میری عمر لکھ دی
بادِ صبح گاہی، شام مقتل میں،
بریدہ انگشت، رہائی کا منظر لکھے
دھجیاں کیا نصف النہار تک بانٹیں؟
چھت سے چپکے جالوں سے،
کفن سیئے جائیں؟
جزا کے گدگروں کی قبروں کے پھول
شمار کرنا چاہیں تو محور سے ہٹیں
اے کنج سورج مکھی، میری بھول کی
کہانی لکھ
بدحالیاں، بدنوں میں اتر گئی ہیں
جدائیاں آئنوں پر لکھی ہیں،
خامشی کے مرغزار، اضطراب کے بچے
گود میں لیئے، لنگر بانٹتے پھرتے ہیں

تعارف

مجھے گرفتار کر کے ایک جھولے میں
چھوڑ دیا گیا ہے
اندھیرے میں دیکھنے کی شکستی کے باوجود
مجھے کچھ دکھائی نہیں دیتا،
کوئی مجھے پکڑ کر پتہ نہیں،
کہاں لے جا رہا ہے،
شائد وہاں، جہاں سے
میں کبھی اپنے گھر کا راستہ نہ پاسکوں،
پٹ سن کے اس خالی بورے میں
میں ایک زخمی بلا ہوں

منکہ

ایک من لکڑی ڈھونے والے بابے کا
منکہ، ایک دن تو ٹوٹنا ہی تھا
موت، ایک مشقت ہے

مٹھیوں کی ریت

دن میں میں مٹھیاں بند رکھتا ہوں،
رات کو سوتے ہوئے، غیر ارادی طور پر
میرے ہاتھ کھل جاتے ہیں،
واقعات ان میں سے اچھل اچھل کر
آنے والے وقت میں چھپ جاتے ہیں،
ان میں سے کئی باتیں کچھ غیر انسانوں کے
ہاتھ لگ جاتی ہیں،
وہ سب اپنی اپنی رسموں کے مطابق
ان کو بھنبھوڑتے ہیں، شکار کرتے ہیں،
جب ریت، مٹھیوں سے بہہ نکلتی ہے،
کون جانے، اس کے ذرّے، کہاں کہاں
گر جاتے ہیں،
انہیں سمیٹنا تو ممکن نہیں ہوتا،
جان پر کھیل کر ہی گذارنا پڑتا ہے

دھمکی

وہ ایک لفظ جو، میرا غلام تھا
آزاد ہوتے ہی، میرا مالک بنا
یہ کیسی حکومت ہے جو دل پر
دھمکیاں دے کر قائم کی گئی

ہما

ہما میں ایک ہی خرابی ہے کہ
اس کی مادہ نہیں ہوتی
روایت ہے کہ زیادہ بوڑھا ہو کر،
وہ خود ہی جل کر مرتا ہے، پھر
اس کی راکھ سے ایک نیا
ہما پیدا ہوتا ہے،
میں سو سال پہلے،
بادشاہت کے شوق میں،
اسے تلاش کرنے نکلا تھا
اچانک میرے اردگرد آگ بھڑک اٹھی ہے،
میں جل کر راکھ ہو گیا ہوں،
شائد میں ہی وہ پرندہ تھا،
جس کا نام ''ہما'' تھا

مشابہت

ماسی کے سامنے، پرات میں،
پیڑے رکھے ہوئے تھے،
پیڑوں کی پیڑوں سے
کتنی مشابہت ہوتی ہے

قبیلے

سنکھ، بھیری، نقارے، نرسنگھے

طرح طرح کے جنگی باجے بجاؤ

اس شور کو اکٹھا کرو، پھر

سفید دودھ جیسے گھوڑے پر

بیٹھا، آدمی، دیوت بجا کے

بڑے پیٹ سے بڑے کام کو نکلے

مقابلے پر دروپدری کے پانچوں بیٹے نکلیں

سب کے سب، جدا جدا اپنے سنکھ بجائیں

ان بڑے بڑے سنکھوں کی متفقہ آواز

آسمان اور زمین میں گونج کر،

دھرت راشٹر کے بیٹوں کے

دل پھاڑ ڈالے

دشمنوں کی صف میں اپنے بھائی

رشتہ دار کھڑے ہیں،

ان سب سجنوں، بھائی بندوں اور کٹمبیوں کو دیکھ کر

میرا ہر عضو، ست ہوا جاتا ہے

منہ سوکھ گیا ہے، دل دہل گیا ہے

رونگٹے کھڑے ہو گئے ہیں، جسم پھنک رہا ہے

میرا دل سخت، بوجھل ہے

کھوٹے شگون نظر آ رہے ہیں

آدھا پیٹ

سر پر دوپٹہ باندھے، ماسی،

روٹیاں لگاتی ہے،

سامنے بیٹھے مزدوروں کا،

آدھا پیٹ بھر گیا ہے

فقیر

اس سوکھے بے جان پیروں کو دیکھ کر

میری بھوک ہی مر گئی تھی

اسے دیکھ کر مجھے ہول آتا تھا

پورے بدن سے گھن آتی تھی

وہ آدھے کٹے کیچوے کی مانند

ادھر ادھر لڑکھتے، سو گیا

چمکتی تیز دھوپ میں، اس کا نیند کرنا

غیر تقدیسی فعل لگتا تھا

میں نے اس کے اندر اتر کر دیکھا

وہ کس کی ننگی چھاتی کو بھینچ کر

آنکھیں بند کئے،

دودھ پی رہا تھا

آڈٹ افسر

نیکی کو بچانے کی خاطر

برائی کے خاتمہ کے لیئے

راست بازی کے فروغ کے لیئے

مجھے ہر دور میں،

نئی کتاب دے کر بھیجا گیا

لوگوں نے، ہر دور میں، میرے جاتے ہی

برائیوں کی چپلیں پہن لیں

تنگ آ کر، اس نے، مجھے

بھیجنا چھوڑ دیا ہے

میرا TADA بند ہوا

رکھ

میری ماں نے، میری پیدائش سے پہلے

رکھ، رکھی تھی کہ وہ مجھے

گیارہ سال، مانگ کر کپڑے پہنائے گی

رکھ رکھنا، آسان نہ تھا

اُلّو کے پٹھے

محبت ایک تجریدی تجربہ ہے،

لفظ، وقت کے ساتھ معنیٰ بدل لیتے ہیں،

زندگی کی پیچیدگیاں لکھنے والے، ادب کو

علامت، تجرید، تلازمہ، خیال، شعوراور

لسانی تشکیلات سے آلودہ کرتے رہے ہیں،

زندگی کی پیچیدگیوں کو ادب کا موضوع بنانے والے

اب ادب کی پیچیدگیوں کے بھنور میں غوطے

کھا رہے ہیں

ایسے الجھاؤ نے، قاری کے ساتھ

رشتہ کمزور کر دیا ہے

وہ کہتے ہیں ابلاغ ہمارا مسلہ نہیں، کوئی بات

قاری کو سمجھ نہیں آتی تو یہ اسکا مسلہ ہے

تو پھر ان تخلیقات کا مقصد کیا ہے،

شاعری، جوادق لفظوں کا جنگل ہے،

ثقافتی ارتقا، جاگتی راتوں کی بلیاں ہیں،

سائنس اور ٹیکنالوجی کے ابلاغ نے ادب کھا لیا ہے

زمانہ بازار بن گیا ہے، ہر شے کاروباری ہے

تفریح سستی ہے، ادب مہنگا ہے،

الو کے پٹھے......!

اضطراب کے بچے

ایک لمحہ وحشت میرے سر پر ٹھہر گیا ہے
زود فراموش سے، چھٹکارا کیسے ہوگا
گل آئندہ کی بہار کی آرزو نے
میرے ماتھے پر میری عمر لکھ دی
شام مقتل میں بریدہ انگشت
بادِ صبح کا، رہائی کا منظر کھینچ
دھجیاں کیا نصف النہار تک بانٹیں
چھت سے چپکے جالوں سے نئے
کفن سیئے جائیں
جزا کے گدگروں کی قبروں کے پھول
شمار کرنا چاہیں تو محور سے ہٹیں
اے کنج سورج مکھی، میری بھول کی
کہانی لکھ
بدحالیاں بدنوں میں اتر گئی ہیں
جدائیاں آئنوں پر لکھی ہیں
خامشی کے مرغزار، اضطراب کے بچے
گود میں لیئے، لنگر بانٹتے پھرتے ہیں

دوست

اُداسی نے تو میرے پیر ہی کاٹ ڈالے
جدائی میرے بدن سے بوٹیاں نوچتی ہے
جذبات نے میرا سر قلم کر ڈالا،
یہ دنیا شائد قاتلوں سے بھر، چکی
بدن کی گلیاں اجاڑسی ہیں،
شاخوں سے چمگادڑیں لٹکی ہیں،
الجھنیں، روح میں اترتی آتی ہیں
جو بھی پتھر گرتا ہے، لوٹ کر نہیں ابھرتا
سارے ستارے، مشل شرر ٹھہرے ہیں
زندگی نے منہ پر طمانچہ مار رکھا ہے
کہاں ہیں میری جنگ کی دوست
دکھ سے نکلوں،
ان کے پاس چلو

ہجرت

اذان کے وقت ہجرت کرو گے تو

اذیت کم ہوگی

ریت اڑے گی مگر دشت میں

وحشت نہیں ہوگی

پانی گدلا ضرور ہوگا مگر

پیاس کو رکاوٹ نہیں ہوگی

دھوپ میں روح زیادہ جلتی ہے،

اجالے میں سانس ڈوبی ہوگی

اس سے پہلے کہ خورشید نکل آئے،

دیا بجھا، سامان اٹھا

روشنی کی کدورت سے نکل

بیل

سینگوں پر اٹھا کر،

زمین پر پٹخ دینے والا بیل

پل صراط، کیسے پار کرائے گا

نیند کی پریاں

خالی مکانوں میں ہوا رک رک کے چلتی ہے

روح کی سرشاریوں کو ایجاد کرتی ہے

گہری نیند کی پریاں لاتی ہے

اس عبادت گاہ میں وہ،

جوتیاں اتار کر داخل ہوتی ہے

خامشی سے بہتی، کمرے میں ڈوب جاتی ہے

میں خوش ہوں کہ یہ،

دھوپ کا کوئی ٹکڑا نہیں لاتی

تنہائی لاتی ہے، جس میں میں اکیلا نہیں ہوتا

ٹی ہاؤس اس کے ساتھ ہے اور میں

سارا کمرہ بجھے سگرٹوں سے بھرتا ہوں

تگ وتاز

اے میری محبت کے خواب

میں تم سے کوئی سوال نہیں کرونگا

تم اپنی بھرپور، تگ وتاز کے ساتھ

اتر کر میری پلکوں پہ بوسہ دو،

میرے اندر اتر جاؤ

کہانیاں

ہر جگہ اک ناٹک چل رہا ہے،
راجے اور فقیر، ایک ہی تھیلی کی
رنگ برنگی زنجیر میں پروئی
الف لیوی، کہانیاں ہیں
پھولوں کی رغبت اور کانٹوں کی وحشت
کوڈیاں ہیں، ایک ہی مالا میں پردئی
زمین کی تہہ کا پانی اور سطح پر پھیلا
بے رنگ، بے بو، ایک ہی ذائقہ ہے
حسنِ یار میں کھوئے دل، بکاؤ مال
یکساں ہیں ایک حال ہیں، یک زبان
سب کے بدنوں میں سوئیاں پروئی ہیں،
سب خطرات کے شہر میں قید ہیں

کڑواہٹ

تیری محبت کی ایک بوند سے
میرے خون میں عمر بھر کی،
کڑواہٹ بھر دی گئی،
میں تیرا ذکر لکھتے لکھتے
عمر کے پار اتر گیا

آؤ

تمام جہان ایک سرگشتہ، جسم ہے،
تم کمبل سے باہر نکلو،
ان کی قلعی کھول دو،
اس ضلالت کی شب دیجور میں تم
شمع ہدایت ہو،
گمراہوں کے پنجہ سے ہمیں نجات دلاؤ
ایک قافلہ عظیم بھٹکا ہوا ہے،
ورطہ ہلاکت میں مبتلا ہے،
ملامت گروں کی پرواہ نہ کر،
چودھیوں کا چاند، آسمان پر چلتا ہے
گو کتے بھونکتے ہیں مگر وہ
ان کی کچھ بھی پرواہ نہیں کرتا

یاد

میرے اندر بلائیں رینگتی ہیں
مجھے چہرے یاد نہیں رہتے
یہ کس کا گھر ہے، کہاں ہوں میں

لمبی قید سے چھٹے لوگ

دودھوں نہائی، پوتوں پھلی مٹی کے
صدیوں کا پھیلاؤ، کس طرح
حرفوں میں سمیٹیں، وہاں تک جائیں، جہاں
زندگی ناپید تھی، روحیں آزاد ہوئیں
اب وہاں، چٹیل چٹانیں ہیں، تپتے صحرا ہیں
کامرانی کے گھوڑوں پر سوار،
آج میں اترنے والے لوگ
جادو کی تاثیر سے زندہ ہیں
ان کے زخموں سے خوف نہیں رستا،
نیلی رگوں میں جمال ہے
حیران ہیں، لمبی قید سے چھٹے لوگ
لڑکھڑانے کی بجائے، خوش ہیں، رقص کرتے ہیں
جن کا ذکر، قدسیوں کی محفل میں ہوتا ہے
یہ ان کی گردنیں مار کر
اگلی نسل میں اتر جائیں گے

مین بلیوارڈ پر

میں اسلام آباد کے کانسٹی ٹیوشن ایونیو پر
ایک لانڈری، ایک حمام کھولنا چاہتا ہوں

تربیت

میں سگریٹ کا ایک زوردار
کش لگاتا ہوں
تم دھیان سے دیکھنا
تمہیں اس میں ایک لڑکی کی
تصویر نظر آئے گی
اگر تم تفکر کی بلندیوں کو
چھونا چاہتے ہو تو
مرغولوں پر دھیان رکھا کرو،
ان میں تمہیں نت نئی لڑکیاں
حسن و جوانی سے بھری ہوئی
نازنخرے میں لپٹی، حسین
جسموں کے زاویوں سے سجی
مورتیں نظر آئیں گی
تمہاری آنکھوں میں پانی اتر آیا ہے
کیا تم اندھے ہونے جا رہے ہو یا پھر
ان کے حسن کی تاب نہیں لا سکتے
اچھا ٹھیک ہے، میں سمجھ گیا
مرغولے دیکھنے سے پہلے تم
تم سگریٹ پینا سیکھو

بدن سے باہر

شہر کو اونگھ آ گئی تھی، میں بھی بدن سے باہر تھا

راستے کے سارے شجر، سفر کی چھاؤں میں تھے

میں تیری آنکھوں سے گر کر، ریت ریت ہوا

مجھے خبر تھی، اس پار چمکتا، کچھ بھی نہیں

میں اپنے اندر گمشدہ کارواں میں گھرا تھا

لکیریں کھینچتا تھا، حدود کا تعین کرتا تھا

بے نشان دنیا کے نشان کیا کام آئے

طوفان کی چھاتی پہ رکھے، آتش دان

شہر میں ہنستے تھے، گاتے تھے رقص کرتے تھے

میں اس کے ہجر میں تھا، حیران بھی تھا

میرے پاؤں پر ڈھیروں سوالوں کا وزن دھرا تھا

تعجب پاؤں چھوتا تھا، بگولے انگلیاں چاٹتے تھے

ہجر نصیبوں کا، آغاز ہو کہ انجام، دونوں مجبوری

میری مری ہوئی آنکھیں، چشمۂ برف زار

میں تھیں

ایڑیاں رگڑتے، سوکھے شہر نے مجھے چاٹ لیا

تختیاں بنانے والے نے، جلی جھونپڑیوں کی

لکڑی استعمال کی

اسے پتہ نہیں تھا کہ بے خبر لوگ ملبے کے نیچے

سو جاتے ہیں

جن کو چھتیں عزیز تھیں، وہ انہیں اوڑھ کر سو گئے

جس برتن میں میری مٹی، پانی ملا کر گوندھی گئی

آج کی رات مجھے، اپنا بدن، اسی میں ڈبونا تھا

انتظار

کارنس کے گل دان، فرش پر پڑے ہیں

مکانوں کی جالیاں، کھڑکیوں کے شیشے

کتابوں کے ورق، زبانوں کے جملے

سب پر دھند کی چادر پڑی ہے

میں جن چیزوں کو جاتے ہوئے چھوڑ گیا تھا

ان کا عکس بھی، آئینوں میں معدوم ہوا

لان کی گھاس، رسوائی کی طرح لمبی ہے،

میرے پتے کا بورڈ، کوئی مٹا گیا ہے،

دیواریں کہتی ہیں، کیوں ہمیں تنہا چھوڑا تھا

دیر موت نہ بھی لائے تو شکستگی ضرور لاتی ہے

میں نئی بیلیں بنانا بھی چاہوں تو

مجھے پرانے زخم بھرنے کا انتظار کرنا ہو گا

سالگرہ

تمہاری شکل
ایک ایسی بچی سے ملتی ہے
جسے میں نے دیکھا نہیں، جانتا نہیں
آج اس کی سالگرہ ہے
اس کے گالوں پر پنک رنگ ہے
آنکھیں بڑی بڑی اور روشن ہیں
اس کے بال نرم اور سیدھے ہیں
بازوؤں اور ٹانگوں پر
روؤں کی ہلکی سنہری تہہ ہے
یہ چھوٹا سا لباس تم پر بے حد بجتا ہے
میں تمہارے لیئے یہ
شکاگو سے لایا تھا
بے بی، تم جلدی سے اپنا دودھ ختم کرو
میں تمہارا گلاس دھونا چاہتا ہوں

فرض کرو

اگر میں فرض کرلوں کہ تم چھوٹی سی لڑکی ہو تو
تمہیں صبح اٹھ کر، برش نہیں کرنا
کیونکہ ہمارے گھر میں تو پانی ہی نہیں ہے
تمہیں یونیفارم نہیں پہنتا کہ تم نے
ابھی سکول جانا شروع نہیں کیا۔
میں تمہیں جنگل کی ایک کہانی سنا سکتا ہوں
جس میں چیڑ اور چلغوزے کے سرسبز درخت
اگے ہیں
ہوا ان میں سے گنگناتی گذرتی ہے
گرمیوں کا موسم آیا ہی چاہتا ہے
جب یہ علاقہ سیاحوں سے بھر جائے گا
پھر کوئی دور بیٹھ کر بانسری بجائے گا
جنگل کے پرندے چہکیں گے، کلکاریاں ماریں گے
تب ہم ایک بیرنگ خط لکھیں گے تاکہ وہ
گم نہ ہو جائے
ہم لکھیں گے کہ ننھی پری کو چھوڑنے کا تم نے
کس طرح حوصلہ کرلیا
(جناب غلام نبی مرحوم کے نام)

راستہ

جنگلوں کے باہر

بہت سے معبد ہیں

جن میں، میں نے

کبھی پوجا نہیں کی

لوگ راستے کے پتوں میں

گم ہو جاتے ہیں

کئی بار تلواریں انہیں چاٹ لیتی ہیں

وہاں ایک میدان ہے جس میں

تاحد نظر پھول ہیں، لیکن

جو کوئی یہاں پہنچتا ہے،

بلیاں، اسے گھسیٹ کر لے جاتی ہیں

انہیں ناپنا ممکن نہیں، ہوتا

غوطہ کھائے، راستوں سے گزرنا

عبادت کے لیئے شانت نہیں

ریت پر رقص

میرے پاؤں سے صحرا باندھ کر

میرے ہونٹوں پہ سمندر لکھ دیا

اس نے میری سوکھی شاخوں کو دیکھ کر

مجھے شجر سمجھ لیا،

اس کی آنکھیں چمکتی ہیں

اسے فیصلے کے دن کا اعتبار نہیں

دانشوروں کے انبوہ کثیر میں

پیشانی پر کرب پڑھنے والا کوئی نہیں

شاخچوں کے کانٹے مجھ سے بغل گیر ہیں

یہ تڑپنا نہیں، پگھلنا ہے،

میری حیثیت اب، وحشت ہے، سناٹا ہے

میں بریدہ پر ہوں، میرا رقص ریت پر دیکھو

کیکلیاں

اے رب نیچے اتر آتا

مل کر جھولے کرتے ہیں

کیکلیاں پاتے ہیں

واقعات

تجھے معلوم ہی ہے کہ پانی نے
طوفان نوح کے زمانے میں کیا کیا
کینہ ور نیل نے فرعون کو جو
صدمہ پہنچایا، اور زمین نے
قارون کے ساتھ جو معاملہ کیا
اور ابابیل نے جو ہاتھی کے ساتھ
سلوک کیا۔ اور یہ کہ
مچھر نے نمرود کا دماغ کھالیا،
داؤد نے پتھر پھینک کر
ریزہ ریزہ کر ڈالا
لشکر جالوت کو شکست دیدی
لوطؑ کے دشمنوں پر پتھر برسے
وہ سب کے سب ہلاک ہوئے،
سارے واقعات تجھے معلوم ہی ہیں
اور بہت سے واقعات ہیں جن کو
میں بیان نہیں کرتا

رانیاں

میں، آسمانی چھپر تلے بیٹھنے کو ترس گیا ہوں
وہاں کے خالی برتن، مجھے یاد کرتے ہوں گے
چڑیاں آ آ کر، پیاسی لوٹ جاتی ہوں گی
عصا کے سہارے، دھوپ کے گھر میں،
پاگلوں کی طرح کون پھرتا ہوگا
کھلی ہوا کی چڑیوں کے ناز نخرے ہی اور ہیں
وہ یہاں کی رانیاں ہیں
ان کے غول کھا پی کر، درختوں کی شاخوں میں
بیٹھ جاتی ہیں، بولنا شروع کریں تو کبھی
چپ نہیں ہوتیں،
میں اپنی تنہائیاں چھپانے کو ان سے
باتیں کیا کرتا تھا
میری بدقسمتی، ایک دن چڑیوں کو مارا جانے
والا کنکر
سیدھا میرے دل میں پیوست ہوگیا،
میں کانپتے کانپتے مرگیا،
مگر اب بھی............

ملاقات

Life is Miserable
میرا موڈ آف ہے،
Date کے لیئے دو تین لڑکیاں
ناکافی ہیں،
مجھے لائٹر سے بڑی نفرت ہے،
سالا، خلال نہیں کر سکتا
تیلی کے بارود کی خوشبو کا اپنا مزا ہے،
بڑھی شیو، الجھے بال، لمبا تڑنگا قد،
انھی پہ لڑکیاں مرتی ہیں
ان کے متنوع موضوعات
Attract کرتے ہیں،
بکواس نہیں، چائے انڈیلو
زیادہ سوالات کو لگام دو،
جس امیر لڑکی نے کل مجھے،
اوورکوٹ کا تحفہ دیا تھا،
مجھے آج اُس پٹولے سے ملنا ہے

لہولہو ملول

ایک بے پرواہ خواب
میری غنودہ ساعتوں میں،
کچی سیڑھیاں اتر کر
برف باری میں لپٹا
میری ششدری کٹیا کے باہر
کھلے میدان میں لیٹ گیا ہے
اسکا چہرہ، فنا کا چہرہ ہے،
اس کی لاش پر روتا کوئی نہیں،
لہو کے چھینٹے، برف پر پھیلتے ہیں
اس نے میرا گھر ہی نہیں،
میرا رستا بھی زخمی کر دیا ہے
میری ساری دعائیں صلے کے لئے
مؤخر ہیں،
میں اس ٹوٹے پھوٹے خواب کا
لہولہو ملول چہرا لے کر
جاگ پڑا ہوں۔

حادثہ

اُسے بلی نے بھنبھوڑ ڈالا تھا،

بے حد زخمی ہو کر وہ جھاڑیوں میں چھپی تھی،

میں اسے نکال کر لے آیا،

اسے گرم کیا، اس کے زخموں پر

ہلدی لگائی، دانہ کھلایا

وہ چڑیا مجھ سے بہت مانوس ہو گئی تھی

صبح سویرے چہچہا کر مجھے نیند سے جگاتی

ناشتہ طلب کرتی،

لنگڑا کر میرے ہاتھ پر بیٹھ جاتی،

آدھے پر کھول کر، ادھر سے ادھر چلتی

ہماری دوستی پکی ہو گئی تھی،

مجھے اس کی عادت ہو گئی

ایک دن جب وہ بالکل ٹھیک ہو گئی تو

ہم نے پیمان باندھا کہ اب ہم

ہمیشہ اکٹھے رہیں گے،

اسی دن وہ چڑیا میرے ہاتھ سے نکل کر

پھر سے اڑ گئی

میں اس کے غم میں روتا ہوں

یہ حادثہ میرے ساتھ دوسری مرتبہ ہوا ہے

آپریشن

پانچ گڑیوں کے ہسپتال میں

دو ننگی ہیں

نرسوں کو پتہ ہے کہ کون سے

شکرے، پرواز کرنے والے ہیں،

ایک کا سر، دوپٹے سے خالی ہے

بوڑھے مسیحا، زوردار نظروں سے گھورتے ہیں

ایک گڑیا کی انگلی سے خون بہہ رہا ہے،

اس کی جلد، ڈریسنگ ضروری ہے، ورنہ

گنگرین ہو سکتا ہے، ATS لگاؤ

ساری گڑیائیں، ڈھیلے کپڑے پہن لیں،

آج ان کے آپریشن ہونے والے ہیں

گُم

شہر نے گھنا ہو کر،

سارے راستے چھین لئے ہیں

عمارتیں دھول سے اٹ گئی ہیں

چہروں پر ٹریفک کا اژدھام ہے

افراتفری نے میرے عزیز، میرے دوست چھین لیئے

ہم اپنے ہی شہروں میں گم ہو چکے ہیں

فاصلہ

جس لمحے میں، زندہ ہوں
کیا نہیں جانتا کہ میں نے،
کافی جی لیا ہے
مجھے پتہ ہے اب بھی ایک رقص کرتی دنیا
میرے بعد وجود میں آنے والی ہے
چاند اور زمین کے درمیان،
محض ایک اڑان کا فاصلہ ہے

رکھشا

جب جب پرتھوی پر
پاپ بڑھتے ہیں،
دھرم کی ہانی ہوتی ہے
تب تب بھگوان
دشٹوں کے سنگھارنے اور
بھگتوں کی رکھشا کرنے کے لیئے
اپنی انوشکتی دوارا پرتھوی پر
پرگٹ ہوئے ہیں

حق

میں خوش خوش مرنا چاہتی ہوں
مگر مجھے کم از کم
بارہ ایسی عورتیں درکار ہیں جو
میرے ساتھ لحد میں اتریں،
ان کے لواحقین میری قبر پر کھڑے ہو کر
روئیں۔ آہ وزاری کریں
میری قبر کشادہ اور آرام دہ تیار کی جائے
میرا کفن ریشم واطلس وکخواب سے
بنایا جائے
لڑکیوں کے باپ حسبی نسبی ہونے کے
دعویدار ہوں اور باری باری،
میری قبر پر پھولوں کے گول والے
ہار رکھیں،
میری چھوٹی بچی کو نشانی کے طور پر
زندہ رہنے کا حق دیا جائے

مبارک

ساری مردہ روحیں،

پھڑ پھڑا کر جاگ اٹھی ہیں،

مُردوں نے بھی گورتن سے

سر نکالے

سب ایک دوسرے کو مبارکباد

دیتے ہیں

ایسی ہی آواز، آسمان سے

جاری ہے

فرصت

میں چاہتا ہوں، پانی مجھے آواز دے

میں اس پر بلبلے دیکھوں،

جب اخروٹ پانی میں گرتے ہیں

مجھے اس سے فرحت ہوتی ہے

یہ بات مجھے غنیمت ہے کہ مجھے

محبوب کی آواز تو آرہی ہے

اگرچہ میری رسائی،

وہاں تک نہیں ہے

مشتعل

تیری چشم میں تو

ڈھلکے کا مرض ہے،

باریک کام میں، اجزا کو

الگ الگ کرنے سے

جدائی کا خطرہ رہتا ہے

کامل کا جوڑا ہوا، الگ ہو جائے تو

اسکا جوڑنا ممکن نہیں رہتا

آفتاب مشتعل طلوع ہو تو

دم عقرب پر کوئی اعتماد کیسے کرے

حوروں کے دسترخوان پر

ویو ہی دیو، موجود ہیں،

نیازی

چل کسی جانب،

منہ کر جائیں،

تم مجھے نیازی پکارنا

میں بھی تمہیں

نیازی کہتا رہوں گا

معاہدہ

مائی گاڈ،

تم میری عادتوں کو جانتے ہو،

میں تمہاری کال لینے والا نہیں

میرے وہم وگمان میں بھی نہیں

میرے بغیر تمہاری آنکھیں

پرنم ہو سکتی ہیں

رندھی آواز سے مجھے

بلانے کی ضرورت نہیں

ہمارے تمہارے درمیان،

وقت کی پابندی کا معاہدہ ہے

اکساہٹ

تم کیسے بھول سکتے ہو کہ

دنیا کی تخلیق

ایک اندرونی ہیجان کا نتیجہ تھا

یہاں ایک تخلیقی اکساہٹ

گھر کر چکی تھی

اس سے چھٹکارا پانے کی

محض یہی صورت موجود تھی

کرچیاں

کچھ کرچیاں میری آنکھ میں

رہ گئی ہیں

زمین، کا لہجہ کرخت تھا،

مکان، بشر، زمین،

سب بوس ہوئے

میں بیٹا تھا، زمین کا،

اس کے سانحہ پر

رونے سے معذور رہا

منظر

سارے پہاڑوں کے چہرے،

ریت سی دھند میں گم ہیں

اس رومان انگیز منظر نے،

نیلی پھوٹتی روشنی کو جکڑ لیا ہے،

طمانیت کشادہ مکانیت کو پھلانگ گئی

نیلا، سفید میں کھو گیا

مغربی ہوا نے بخارات کو

گنبد میں بدل کر،

روحانیت وروحیت کو تخلیق کر دیا

نیلا رنگ

تصوف آمیز لینڈ سکیپ میں،
نیلا رنگ
'Starry Night' کی
ادراکیت سے نکل کر،
ماورائی سمت سفر اختیار کرتا ہے
عالم جنون، ''بھری جنت دوزخ'' دکھلاتا ہے
تن تنہا دلوں میں، موت کی سرحدوں کے باہر
حیات لاموت ہے،
جہاں ہر شئے بے آواز ہے
نیلی ہے

کوئی شخص

رات کے پچھلے پہر،
میں نے اپنے دروازے پر
دستک دی،
کیا کوئی شخص یہاں سے
چلا نہیں گیا،
کوئی شخص مر تو نہیں گیا

چابیاں

ممکن ہے تمہیں بھی مجھ سے محبت ہو
یہ بھی ممکن ہے کہ ایسا نہ ہو
ممکن ہے تم لوٹ کر ہی نہ آؤ
مگر یہ تو خام خیال ہو سکتا ہے
کیونکہ بہر حال تم نے محبت سے
میری چابیاں چھین لی تھیں،
میرا دل خوش کر دیا تھا،
جگہیں ویران اور تھکاوٹ سے
بیزار پڑی ہیں
میری چابیوں اور تمہارے بغیر

وجہ

تم نے شعلہ بار آنکھوں سے
دیکھ کر میرا دل
دو ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا
میرا دل توڑ دیا،
میں رو رہا تھا،
میں رو رہا تھا تبھی
تمہاری وجہ سے

خراٹے

پچھلی رات خوف سے
میری آنکھ کھل گئی تھی
مجھے لگا تھا، دوزخ میں
ایک اودھم، ایک شور مچا ہے
میں نے دیکھا،
اس کا منہ ایک کنویں کی مانند کھلا تھا
میں نے اسے جگاتے ہوئے کہا
دیکھنے میں تم ایک عورت لگتی ہو
مگر تمہارے خراٹے
ایک مجمعے کے ہیں

جواز

میں جو کہتا ہوں
میرے سوگ میں آنے والے
سرخ لباس میں ملبوس ہوں
اعلان کرو کہ
میرے مرجانے میں
کوئی خاص جواز نہیں ہے

تمہارا نام

میرے ذہن میں بسی،
تمام خواہشوں کو تمہارا
نام معلوم ہے،
میرے دل کی سفید خواہش کا
تم سے خاص ربط قائم ہے
میرا بدن تکمیل کی خواہش میں
تمہارے بدن کو پکارتا ہے
میرے خون کی دھڑکنوں میں
تمہارا نام دھڑکتا ہے
تمہارا نام۔تمہارا نام

بیزار

الصبح،
میں دو مختلف جوتے پہنے
یہاں بیٹھا ہوں،
اے میرے رحمدل مالک
تجھے کوئی اعتراض؟
میں بہت بیزار ہوں

تنہائی

اکثر تنہائی میں بیٹھ کر
سوچتا رہتا ہوں،
میرے پاس اس تنہائی کا
کوئی جواز نہیں،
میں یہ بھی سوچتا ہوں
آہستہ آہستہ، بتدریج،
میں تنہا نہیں رہوں گا

بادشاہ

چڑیلوں
کا ایک گروہ
میری ریڑھ کی ہڈی پر
بیٹھ گیا ہے
میرے مہروں کے ہر جوڑ میں
میرے گناہ، سنسنی کی صورت
چھپے ہیں
چڑیلیں میری ہڈیوں سے درد کی ٹیسیں
چوستی رہتی ہیں
چڑیلوں کا بادشاہ، میرا دوست ہے

دُعا کرو

ہر شعبہ محنت سے پڑھتا ہے، اپنا سبق
دیانت کا، شجاعت کا، عدالت کا
طوطے طوطیوں کو اب زبانی یاد ہو گیا ہے
کورس میں تبدیلی سے نصاب پر کیا گذری
ہمارے پاؤں ننگے ہیں، سر پر اینٹیں ہیں،
کچھ لوگ بدلے کی آگ، دل میں لیئے
گیہوں کے ساتھ گھن۔ پیس رہے ہیں،
چکیاں ناقص ہیں، بزدل ہیں، کھنڈی ہیں
جو گیہوں پیس نہیں سکتیں، گھن کے ڈھیر لگاتی ہیں
رعشہ زدہ ہاتھوں میں پکڑی دعاؤں کا ثواب
موخر کر دیا گیا ہے، دودھوں نہاؤ، پوتوں پھلو،
کسی دجال کے آنے کی، دعا کرو

فرق

بارش سے بھیگی چڑیوں نے

قبرستانوں میں پناہ لے لی ہے،

لڑکوں بالوں نے کپکپاتی روحوں کو

جیبوں میں بھر لیا ہے،

میں بچوں کو ایک ایک روپیہ دے کر،

انہیں آزاد کرتا ہوں،

غلام اور چڑیا میں کوئی

فرق نہیں ہوتا

پرساد

مندر میں

ایک لڑکی

پنڈت سے پرساد لے کر جھک گئی

مہاراج، مجھے گیان کی کوئی بات بتائیے،

آٹھو بیٹی۔ انگیا پہنا کرو،

ماتھا ٹیکنا

دھیان، گیان، دونوں کو

برباد کرتا ہے

خطرات

خطرات تو سارے،

احتیاط کی دیوار کے پیچھے بیٹھے ہیں

اگر تم نہیں جانتے کہ تم کہاں جا رہے ہو تو

ممکن ہے تم کسی اور جگہ کو سمیٹ دو

درد تو عارضی ہوتا ہے،

اس سے نکل جانا، دائمی ہے

تمہاری یکساں کوششیں، یکساں نتائج نہیں لائیں گی

جستجو اور تبدیلی کی کوششیں، حماقت ہوتا نہیں سکھاتیں

ہر شخص، بُرے حالات کا سامنا کر سکتا ہے مگر

تم اسے طاقت دے کر دیکھو

خواب، جادو کے زور پر حقیقت نہیں بنتے

مسائل کی سب سے خوبصورت بات

یہ ہے کہ

ان میں بہت سے وجود ہی نہیں رکھتے

برانڈ

دو ہفتوں سے میرے برانڈ کی ایک ڈبی

میری جیب میں پڑی ہے

جب سے قیمتیں بڑھی ہیں، میں

اسے ہاتھ لگا کر ہی

اپنی طلب مٹا لیتا ہوں،

میں سوچتا ہوں سستی سگریٹیں لے کر

کچھ دن گذارا کروں

میری جیب میں صرف پچاس روپے ہیں

میں نے نوٹ پانفروش کی طرف بڑھا کر

سگریٹ کا ایک اور برانڈ مانگا،

اس نے میرے ہاتھ میں دو پیکٹ تھمائے تھے

جادوگرنی

جادوگرنی کہتی ہے،

اب تمہارے جینے کا جواز نہیں

تمہاری بہت تھوڑی عمر آن بچی ہے،

تم مجھ سے محبت نہیں کرتیں،

اسے سہن کرنا، مجھ پر مشکل ہے،

اس نے ایک اور کارڈ نکال کر

مجھے دکھایا جس پر

لوح، محفوظ کا عکس تھا،

اس پر لکھا تھا، میرے لیئے دنیا میں

کچھ بھی اچھا باقی نہیں بچا

مجھ سے بدقسمت روئے زمین پر نہیں

مجھے نہیں پتہ، اب کیا چمتکار ہونے والا ہے

مگر میں تمہاری جگہ ہوتی، تو

خود کو مار ڈالتی

امن کی آہٹ

سرخ رنگ بند گلاب،
آگ کی طرح دہکتا ہوا،
سورج کی پہلی کرن کے ساتھ
امن کی آہٹ پا کر
کوئی لمحہ گذارے بغیر
تیزی سے کھل جائے

تہہ

پتیوں کی تہہ بٹھا دی گئی ہے
سورج انہیں بھول چکا
جو درخت جنگل میں اُگے تھے
سر اٹھائے، بدن تانے،
لہراتے تھے، ہاتھ ہلاتے تھے،
انہیں چمکتا اب کون دیکھے گا
انہیں تلاش کرو،
زمین پر کہ ان کا بدن،
بکھرا ابھرا ہو کر، تہہ ہوا

نیزے سنبھالو

لوگ دار تک مجھ کو کھینچ لائے ہیں
نیزے سنبھالو، سیدھے کرلو،
مجھ کو ابھی اوپر اچھالا جائیگا
دیمک زدہ زبانوں والے کافر،
روح کو رخصت کرنے کے عمل میں
سبقت لے جانے کو تیار ہیں
زمین سے آخری خیمہ ہٹا دیا گیا ہے،
بخت کی ویرانیوں پر شاکر لوگ
معاف کرتے ہیں
سورج کبھی نجوم کا حصہ نہیں بنتے

میرے پرے آؤ

میرا پرانا کوٹ،
ایک میخ پر ٹنگا ہے،
میں غیر مرئی آوازوں کو اچھل اچھل کر
پکڑتا ہوں،
مجھے جوتوں والے پاؤں کی ضرورت نہیں رہی
میرے پرے آؤ،
مجھے کوئی بلاتا ہے

بھوک

جب وہ میرے وجود سے لپٹ جاتا ہے
میں اس کے بدن میں
اس طرح تحلیل ہو جاتی ہوں کہ
کوئی میری موجودگی کو،
محسوس بھی نہیں کرسکتا،
میری گرفت اس پر بند چاقو کی طرح
ہوتی ہے
میں اسے قطرہ قطرہ پیتی اور
ٹکڑا ٹکڑا کھاتی رہوں گی
پھر مجھے کوئی دن، بھوک لگنے والی نہیں

واپسی

میں اس کے ساتھ،
سمندر کنارے ٹہل رہا تھا،
سونامی اسے گھسیٹ کر
ساتھ لے گیا،
اب برسوں سے میں یہاں
ٹہلتا ہوں،
لہریں، میرے پاؤں میں سر پٹختی ہیں
مگر میں اسے واپس لینے پر تیار نہیں

تباہ

کفن بدوش، خوفناک بلائیں
برہنگی کا لباس فاخرہ پہنے
امکان یقین سے باہر کھڑی ہیں
زمین کی تہوں سے خاموشی کی
خوف آلودہ صدائیں آتی ہیں
لوحِ جبین پر سناٹا لکھا ہے
لحد کی رگوں میں زہر آلود خون ہے
لاشوں کے سر احتراماً جھکے ہیں
ہنسی مذاق نہیں ہوتا، پار اتر جانا
تباہ کرنے والوں پر اب بھی حساب تنگ ہے

کونہ

تم سے مل کر بھی ملاقات نہ ہو پائی
لوگ تھے، کوئی کونہ خالی نہ تھا،
وہم اور ان کہی باتوں کے پردے،
درمیان میں تنے رہے
میں دل کو خالی لے کر لوٹ آیا
یہ چانس بھی، یونہی گذر گیا

جال

خاتون، تمہارے کندھوں پر

محبت کا یہ گراں بوجھ

جھوٹا ہے،

وہ شخص جسے تم اپنے،

مقدر کا ستارا سمجھتی ہو

جو تمہیں یقین دلاتا ہے کہ

وہ ہمیشہ سچا تھا، اور

اس نے کسی اور سے کبھی محبت نہیں کی

حقیقت نہیں،

اچھا ہے تم اس کے جال سے

نکل بھاگو

بُھوک

مرے ہوئے آدمی کے دانتوں پر

بھوک جمی بیٹھی ہے

اس کی خشک کھال سے جھانکتے

کیکڑے، بوڑھی خوراک کے کچرے پر

آنکھیں موند کر سوتے ہیں

بچ رہنے والا، چتکبرا گھوڑا

کائی زدہ مینڈک کی طرح،

لاغر ہوتا جا رہا ہے

مراقبہ جزیات

الاؤ کی آگ سے وہ رات

کندن بن کر نکلی تھی،

کثافتیں ساری، پیالوں کی

تہہ میں بیٹھ گئیں،

سگریٹ جل کر کالی راکھ ہوئے

سرمئی اجالے سے پہلے ہوا میں

تحلیل ہو گئے

وہ طویل رات اب

مراقبے کی صورت مجھ میں

بند ہے،

آنکھ بند کرتے ہی، میں

جزیات کے ساتھ اسے

دیکھ سکتا ہوں

انگڑائی

چودہ سو سالوں کے بھوکے کنجڑوں کی

سانسیں کشادہ ہو گئی ہیں

بوڑھی لڑکھڑاتی ہوا،

رسوم اور قیود کو متروک قرار دے کر

انگڑائی لے اٹھی ہے

محبت کا ایک حصّہ

میں تمہاری محبت کی
احسانمندی چکانے کی
طاقت نہیں رکھتا
میں اس کے لیئے اپنے خالق سے
تمہارے لئے ہزاروں گنا،
اجر مانگتا ہوں، مگر
میں سمجھتا ہوں کہ ہمیں
آج کی اس محبت کا ایک حصہ
بچا کر رکھ لینا چاہیے، تا کہ
جب ہماری محبت کی گرم جوشی
ماند پڑ جائے
ہم اس کے سہارے،
باقی عمر بسر کر سکیں

'بھک' کی آواز

جنگ میں سپاہیوں نے،
اپنی مٹھیاں بھینچ کر، زور سے
تقدیر کو جکڑ رکھا تھا،
اچانک اخبار کے ایک کالم میں،
وہ 'بھک' کی آواز سے اڑ گئے
ان کی جیبھیں ایک لفظ بھی،
ترکے میں چھوڑ کر نہیں گئیں
چند تمغے ان کی بوٹی بوٹی لاشوں پر
نوحے کی تسبیح پڑھتے ہیں
ان کے بوٹوں نے اپنی شناخت
بدل لی ہے
وہ ہانپتے کانپتے، اپنے دروازے
کھٹکھٹاتے ہیں،
ان کے سوا، کچھ بچا ہی نہیں تھا
اس لیئے انہیں وردیاں پہنا کر
دفن کر دیا گیا

زندگی کا نظم ونسق

میں قاصر ہوں اسے لکھنے سے کہ تیری باتیں، کم عمر گائیوں کا لکلا دودھ ہیں، یہ امرت سے برتر ہے، جو اس کا مزا لیتا ہے۔ آسمان کی چوٹیوں پر بیٹھے لاما اور پرنکے فرشتے، پاتال میں چھپے ہیں، غاروں میں مالا جپنے والے یوگی سب پاک نہروں میں اترے بغیر، اس گیان کا مزا لوٹنے میں لگے ہیں، تیرا قرب، تیری باتیں مجھ کو برہم گیان، مہاتم بدھ کا اپدیش ہیں، یہ جہان، سنیاسیوں گیانیوں، تیاگیوں اور گیان یوگ کی کان ہے۔ دودھ مجھ کو شانتی اور لذتوں سے ہمکنار کرتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں آدمی روز نہانے سے صاف رہ سکتا ہے مگر میں تو تیرے ساتھ لیٹ کر پوتر ہو جاتا ہوں۔ میری جنم جنمانتر کی کثافتیں دور ہو جاتی ہیں۔ تو مجھے کب کا چھوڑ کر جا چکا۔ اب میرا یہ سب سے اتم گیان ہے اور میں اسی کے سہارے اپنی زندگی کا نظم ونسق چلا رہا ہوں۔

اندھے اونٹ کی مہار

تمہارا نفس تو کوے جیسا ہے، تم دل کی مسجد اقصیٰ میں نہیں جا سکتے، دل کی فکر تو گھاس جیسی ہے جس میں بانس اُگ آئے ہیں۔ دل کے افکار پر غور کرو، وہ تمہیں گورستان لے جانے والا ہے۔ مجھے اس کی مجلس سے لے چلو کہ میں، پھول اگانا چاہتا ہوں، مگر اب تو خاموشی بہتر ہے۔ سننے والے سب کے سب نااہل ہیں۔ کشتیوں والے تاوان ادا کریں گے۔ اندھے اونٹ کی مہار، گردی ہے، ساربان جذاب شر ہے پوشیدہ رہنے کی مصلحت، وہ کتا ہے۔ جس کے پیچھے ایک کافر چل رہا ہے۔ دیو مسخرہ بنا، خباثت دکھاتا ہے۔ میرا سایہ میرا قیدی ہے، ہر بچہ، بڈھا، اپنے پاؤں کو کھینچتا ہے۔ گائے قصائیوں سے واقف نہیں تھی ورنہ، ان کے ہاتھ کا بھوسہ کیوں کھاتی جو اپنی چاپلوسی سے، اس کا دودھ کھینچ لیتے ہیں۔ جس کے ہاتھ میں تیری چابی ہے۔ اس کے پیچھے مت بھاگ، آخر میں، وہ تجھے ننگا کر دے گا۔ اپنے منہ کو گھٹنوں میں تہہ کر لو، نیند جیسے گڑھے میں اتر جاؤ، نیا گھاس، نئی بوٹیاں تلاش کرو، وہ باغات جو اصلیہ سے بھاگے ہیں، ایک خیال پر یہ کھیل کر رہے ہیں۔ تم چیزوں کو ٹھیک دیکھ لو گے، مگر (اب) دیکھنے سے کیا فائدہ

تنی رسی پر رقص

میرے پاس ایک سو بیس روپے ہیں، چلو چل کر کچھ پتھر خرید لیتے ہیں، تمہارے دانت کافی مضبوط ہیں، روشنی، اندھیرا، پانی، سب زندہ درخت کی چھال ہیں۔ ان کو ہمیشہ آگ کا شگن دیا جاتا ہے۔ زندگی میں خون سے لکھے گئے پہلے لفظوں کی یاد ایک لطیفہ ہے۔ پھٹے پرانے کپڑوں سے بجو کا بنایا جا سکتا ہے، کسبیوں کی اولاد کے لیے بجو کا بننے کی بھی گنجائش نہیں۔ امید کی لاشیں تنی رسیوں پر ناچتی ہیں، محبت کا دروازہ کھولنے کے لیئے جنگل کا جنگل، جلانا پڑتا ہے، بے قصور لوگوں کی باتیں صرف خوف سے لکھی جاتی ہیں۔ جنھیں بعد میں کوڑوں کے ڈھیروں کے ساتھ، جلایا جاتا ہے تاکہ ان کی حرمت میں کوئی فرق نہ آئے۔ جب پتے سرخ اگنے لگیں کو درختوں کو پھانسیاں دے دی جاتی ہیں۔ جن کے پاؤں زیادہ ہوتے ہیں، اکثر رات کو چلتے ہیں۔ تصویریں کبھی نہیں بولتیں، ریت تو ہمیشہ سے ہی یتیم تھی، بچیاں تعلیم کی کالی چادر اوڑھے، اس وقت تک پڑھتی ہیں۔ جب تک کوئی شکار ہاتھ نہ لگ جائے۔ وہ سب امارت پسند، حقیر مخلوق ہیں، جو سرکاری سکولوں کے زمانے سے ہی، تیر اندازی اور نیم گرم آنسو بہانے کا عمل سیکھ جاتی ہیں، محو اختلاط کبوتروں کا منظر سب کو سمجھ میں آتا ہے۔ باپ چوراہوں پر کھڑے، ٹریفک چلاتے ہیں، جلوس میں شامل کئی بیٹیوں پر نظر رکھتے ہیں، جلدی جلدی ہر زندہ چیز کو، مجسمے میں بدلتے جاتے ہیں۔ بدنیتوں کی نیت نہیں بھرتی، بوڑھوں کی عمر نہیں ڈھلتی۔

دیوار

دیوار سے چپکی پرچھائیاں، سپلٹ ہو کر، قدم آدم تصویروں کی طرح، لٹک گئیں، بے حرکت ہو گئیں، ناؤ کی تصویر، چڑیل نظر آتی ہے، خوفزدہ لوگ، اس کے منہ میں سہمے، لرزتے ہیں، کنارے کی آس رکھتے ہیں۔ دو خوفناک فرشتوں نے، پانی سے نکل کر، کچھ مسافروں کو، ابلتی کڑاہی میں غوطے دینے، شروع کر دیئے ہیں۔ ان کی آنکھیں، آگ کے گولے ہیں۔ اچانک کشتی کی ایک لڑکی نے، چیخ کر اپنے ہاتھ بلند کر دیئے ہیں۔ اس کے بدن سے شعلے نکلنے لگے ہیں، اس کی کمر سے بندھی گھنٹیاں اس کے، دائرہ رقص میں ایک

سریلی تان پیدا کرتی ہیں۔ ناچ کے شعلے، آگ ابل رہے ہیں۔ فرشتے کچھ دیر کو مبہوت، ساکن ہو گئے ہیں، کسی گڑی میخ کی طرح، رکے ہیں، گنگ ہیں، لڑکی کے ہاتھ سے نکلی ایک لپٹ نے، فرشتوں کو سرتا پا لپیٹ لیا ہے۔ انہوں نے کود کر جانیں بچائیں ہیں۔ منظر روشن ہو رہا ہے، اب ناؤ میں کوئی بھی سوار نہیں، دیوار میں دراڑ ہے۔

بلند ہاتھ

میں نے اپنے خاندان، عزیزوں، دوستوں کے ستانے پر، گھر بار چھوڑ دیا۔ جنگلوں کا رخ کر لیا، ایک گیانی، درختوں میں دھونی رمائے، رتجگے کرتا تھا، ہم دونوں مل کر اداس رہتے، میں نے ایک بار، اُس کی اداسی کا سبب پوچھا۔ کہا، میں ایک محنتی، تجارت کرنے والا تھا۔ بہت دھن کمایا، پھر بڑھاپے نے آن لیا، لڑکے بالے جوان ہو گئے، مال پر قابض ہو گئے۔ زندگی مجھ پر تنگ کر دی گئی۔ میری عورت نے لڑکوں کا ساتھ دیا۔ سب نے مل جل کر مجھے گھر سے نکال دیا۔ مجھے اب بیوی اور لڑکوں کی فکر دامن گیر رہتی ہے کہیں، بن محنت پائی دولت سے سب برباد نہ کر دیں۔ تندرستی ان پر عاشق رہے پتہ نہیں وہ میری بیوی کو کھانے سے محروم تو نہیں رکھتے۔ مجھے انہوں نے گھر سے نکالا مگر میں پھر بھی، ان کے خیال سے ایک پل کو بھی چھٹکارا نہیں پاتا۔ یہ خون اور دوستی کے رشتے بھی کیا ہیں۔ کتنے ہی برے کیوں نہ ہوں، آدمی کا دل انہی میں مبتلا رہتا ہے۔ ان کا نفرین سلوک بھی میرے ہاتھ بلند نہیں ہونے دیتا۔ رشی نے کہا

تنقید

میں جاننا چاہتا تھا کہ لوگ، محبت میں کہاں تک جا سکتے ہیں۔ مجھے مسجدوں، مندروں کے ضابطوں کا پتہ نہیں، میری سمجھ میں نہیں آیا کہ، دو روحوں کی دنیاوی جڑت میں ان کا کیا کام۔ درد میرا پیچھا کرتا ہے، سنسناہٹ میری ریڑھ کی ہڈی سے ہوتی ہوئی، میری ٹانگوں میں اترتی ہے۔ میں اولی تشبیہات میں اس کو، ساری عمر پالتا رہا ہوں۔ میں اس کہانی کو زیادہ دلچسپ اور جاندار بنانا چاہتا ہوں، تا کہ آپ کی طبیعت، اس بوجھل اور بیمار موضوع سے اکتائے نہیں۔ کتاب لکھتے ہوئے آپ اپنا وجود، خارج نہیں کر سکتے۔ لوگ مجھے موسمی لکھاری سمجھتے ہیں، لیکن مجھے اس آدمی کی تلاش ہے جسے آپ سے سے زیادہ قابل بھروسہ سمجھتے ہیں، پیار کرتے ہیں۔ کہانی میں کسی بدقماشی کی صورت قبول نہیں کر سکتا۔ جس طرح آپ کہانی کو، الٹتے پلٹتے اور کاٹتے ہیں، مجھے ہضم نہیں ہوتا۔ کہانی لکھنا، خود کو صفحے پر اتارنا ہے۔ میں اس کی محبت کے بیان میں، کہیں چلا جاؤں، اگربتیاں جلاؤں، سجدہ کروں، پوجا کروں یا آگ سینکوں، رہے گی تو میری کہانی ہی؟

سلسلہ وار

پورا کمرہ تنور کی طرح سرخ ہو چکا ہے، سرمئی روشنی، سرخی پکڑنے لگی ہے، پرچھائیاں تصویروں سے نکل کر دیواروں کے ساتھ کھڑی ہو گئی ہیں، لوگ بھوت بنگلے کے قید انسان لگتے ہیں، کڑاہیوں میں نسواری تیل ابل رہا ہے، دو کالے خوفناک چہروں کو فریم سے نکال کر جلتے تیل میں ڈبویا جا رہا ہے، غوطے دیئے جا رہے ہیں، پہلی ڈبکی کے بعد ان کی آنکھیں روشن ہو گئی ہیں، انگارے کی طرح دہک اٹھی ہیں، چند برہنہ عورتیں، دھیرے دھیرے بڑھتی روشنی میں، ڈھول کی ابلتی آواز کے ساتھ، زور زور سے چھاتیاں ہلاتی ہیں، آوازیں چنگھاڑوں میں بدلنے لگی ہیں، آگ میں تپتی سلاخیں، مردہ فریموں پر داغی جا رہی ہیں، اس قید سے رہا ہوتی روحیں، چمگادڑوں کی طرح فضا میں چکر لگانے لگی ہیں، دھیرے دھیرے چھت کھسک رہی ہے۔ اندھیرا اچھلتا جاتا ہے۔ رقص موقوف ہو جاتا ہے، اگلی رات کے تیسرے پہر تک منظر موقوف ہے، باقی سلسلہ یہیں سے جوڑا جائے گا۔

باہر کی دنیا

میں نے سوچا مجھے، باہر کی دنیا بھی دیکھنی چاہیے، یہ سوچ کر میں، آبادی میں نکل گیا، پہلا آدمی جس نے مجھے دیکھا، یکا یک اسکا چہرہ فق ہوگیا۔ وہ بھاگ کر پاس کی جھونپڑی میں گھس گیا۔

دوسرا آدمی جو مجھے ملا، کچھ ضعیف تھا، مجھ پر نظر پڑتے ہی، ایسا لگا، جیسے اسے گاٹھ مار گیا ہو، اس کے ہونٹ پھڑ پھڑانے لگے بھنویں اٹھ کر، اس کے گنج سے ٹکرانے لگیں، کف اس کی باچھوں سے بہہ نکلا دھڑام سے گر کر بے ہوش ہوگیا۔

تیسرا آدمی مجھے دیکھ پر پھٹی قبر میں، اٹھ کر بیٹھ گیا اس کی سانس، اچانک بند ہوگئی اور وہ، دوبارہ مر گیا۔

اگلے آدمی کا چہرہ جیسے رسیوں سے بنا تھا، اس کے پاؤں سوکھے اور بے جان تھے لیکن اس کی، آنکھیں روشن تھیں۔ اس نے بوکھلا کر، میری جانب دیکھا اور سانس پھلانگ کر اپنی، بائیں کروٹ لیٹ گیا، اب اس کی آنکھیں، بند تھیں۔ میں واپس اپنی پرانی گڑھی میں لوٹ آیا۔ اس کی جلی دیواروں میں کوئی کھڑکی نہیں تھی، صرف ایک پست دروازہ تھا اور تنہائی یہاں گونجتی تھی۔

تلاشی

جادو کے مہاتماؤں نے سچ اور جھوٹ، موجود وغیر موجود کی حقیقتوں کو جان لیا ہے۔ ان کے ذہنوں نے، ذہن نشین کرلیا ہے کہ سنسارک جال کس کا پھیلایا تماشا ہے، جو برہم اوناشی ہے، اس کا کوئی ناش نہیں کر سکتا۔ شریروں کا سوامی، نیتہ، اوناشی ہے، یدھ، فانی اجسام کی محبت کا متحمل نہیں۔ زندگی گذارنا مشکل کام ہے، نشہ پلایا جائے کہ زہر دیا جائے، وہ مر نہیں سکتا۔ وہ تو تیر اندازی اور نیزہ بازی کا ماہر ہوگیا ہے، ٹھیک ٹھیک نشانے لے سکتا ہے، جادوئی منتروں کے ذریعے، پھینکے جانے والے اُستروں اور قندیلوں کا ماہر ہو گیا ہے۔ تیر کمان سے معجزی کارنامے، سرانجام دے سکتا ہے۔ بڑے برگد کی ایک ٹہنی جھکی ہوئی ہے، سخت اور مڑی ہوئی، بالکل کہنی کی مانند، جیسے ایک رسی لٹک رہی ہو، ہلتی رسی نے ہوا روک دی ہے۔ سانس روکا

ہوا جنگل ایک انسان لگتا ہے۔ ایک عمر رسیدہ جانور ایک غیر مانوس آواز سن کر رک گیا ہے۔ بلند قامت جانور رسی کی پہنچ میں ہے۔ جانور کی بھیانک چیخ، اس کے پھیپھڑوں سے باہر نکل آئی ہے۔ بچپن سے بڑھاپے تک پھیلے اس جنگل میں کسی نے جواب نہیں دیا، آزاد رسی کے دونوں سرے، نشے میں لہرا رہے ہیں۔ جادوگر ایک جھاڑی کے پیچھے سے اپنی کودنے والی رسی کو واپس مانگتا ہے۔ ہوا جب تیسرے پہر اس سے ملنے آئی تو اس نے ہوا کی تلاشی لی تھی۔

پہلا پتہ

رسد کے راستے کٹ گئے تھے، دریا لاشوں سے پٹے، بھوک سے بے تابی کا منظر بڑے بڑے پوسٹروں پر آویزاں ہو گیا، حرکت کرتے، سانس لیتے جسم ان گنت خیموں میں بٹ گئے ۔ جسموں کی بھٹی پر دانشوروں نے قبضہ کر لیا، آنکھ کے آئینہ خانے اندھیروں میں ان کو چنتے تھے۔ مٹی پر خاموشی کا پانی پھرا تھا، کتے مالکوں سے چمٹے، مٹی کے دلدلی قالینوں پر بیٹھے، ان کے تلوے چاٹتے تھے، پانی تھا مگر تشنگی کا عذاب اتر آیا تھا۔ رگوں میں لہو کی ہلچل، اوس کھائے پتے بنی، سائے تلاش کرتی تھی۔ وہ آنکھیں بند کئے رنگ برنگی، بگھی والوں کو آتا دیکھتے تھے، جن کے تیز رفتار پہیئے، اپنے سیاہ چمکیلے گھوڑوں کی برہنہ پیٹھوں پر چابک برساتے، انہیں ساتھ لے جانے آئیں گے۔ ان کی نثری نظمیں آسمان کی سمجھ سے باہر تھیں، وہ کناروں کی طرف آنے والی ندیوں کے، رُخ، آدھے راستے سے پھیر دیتا کوئی ہاتھ، ہوا میں لگی گھنٹی کا بٹن نہیں دباتا تھا، کوئی تنکوں والا پیالہ لے کر نہیں آیا، اُن کے ننگے بالوں والے سینوں پر قسمت کے مقید ستاروں کے جھرمٹ تھے۔ خامشی نے کئی بار کالی شلواریں کھولیں، مگر لوگوں کی رگوں میں صدیوں کی تھکن غالب تھی، سردی، سر نیہوڑائے، اترتی آتی تھی، آنکھوں کے آنسو، گالوں پر ٹھہر گئے تھے جیسے اکثر بچے کی ایک تصویر میں گال خشک ہو مگر آنسو گال پر ٹھہرا ہوتا ہے، بے دری کے دروازوں کو سب نے کھول رکھا تھا کہ خزاں آئے تو پہلا پتہ ان کے گھر سے گرے۔

انہیں کہنا

انہیں کہنا، دسمبر آ گیا ہے، ایک اور خزاں اور گرما، وقت کی گرد میں کھو گئے، اس سال بھی انہوں نے، اپنی کھیتیاں بچا کر، ہمارے ہزاروں مکان، دریا برد کر دیئے ہیں، انہیں کہنا، انہوں نے ہمارے پہاڑی بھائیوں کو اغوا کر لیا ہے۔ موت کے گھاٹ اتار دیا ہے، انہیں کہنا، انہوں نے ہمارے کھیل کے میدانوں کو اپنے ہیلی کاپٹروں کے ہیلی پیڈوں میں تبدیل کر لیا ہے۔ انہیں کہنا، انہوں نے ہمارے بچوں کے میدانوں کو کوڑا جمع کرنے کے احاطے بنا دیئے ہیں۔ انہیں کہنا، انہوں نے ہمارے سپاہیوں کو ایک مستقل جنگ میں دھکیل دیا ہے۔ انہیں کہنا، انہوں نے ہمارے محافظوں کو اپنے گھروں اور گاڑیوں کے پیچھے بھاگنے والے کتے بنا لیا ہے۔ انہیں کہنا، انہوں نے ہماری آئندہ نسلوں کے تمام وسائل لوٹ کر یہاں سے منتقل کر دیئے ہیں۔ انہیں کہنا، انہوں نے ہماری درسی کتابوں پر اپنی تصویریں چھاپ لی ہیں، وراثتی نشانوں پر اپنے نام لکھ لیئے ہیں۔ انہیں کہنا، ہمارے درجنوں بھائی ایک ایک دن میں، ان دیکھی گولیوں کا شکار ہوتے ہیں۔ انہیں کہنا، تمہاری ایک ہجرت کی منظوری کے بعد اب ہم ہر سال نئی ہجرت کرتے ہیں۔ انہیں کہنا، انہوں نے ہماری سانسیں نوچ لی ہیں، ہمارے بدنوں کے ٹکڑے کھا لیئے ہیں۔ وہ کیسے بے غیرت مالکان ہیں۔ جنہوں نے ہمیں ایسی لعنتی کردار، غیر محبت وطن لوگوں کے سپرد کیا، ہم سب کے ہاتھ بدعا کے لیئے اٹھے ہیں، انہیں کہنا، اگر ہو سکے تو اگلے دسمبر سے پہلے ہماری پرانی عمارتیں، ہمارے پرانے لوگ لوٹا دیں۔

ہدایت کار کی بیوی

کوئی سایہ ہے جو میرے تعاقب میں سانس لیتا ہے، عمر کے ساتھ میرے ہاتھ موٹے ہو گئے ہیں، اگر سانس موٹی ہو گئی؟ گلے میں پھیلاؤ کی زیادہ گنجائش نہیں ہوتی۔ شاور کے نیچے، سفید کپڑوں میں میرے ساتھ ایک آدمی کھڑا رہتا ہے، نفسیات دان میرا شجرہ نسب پوچھتے ہیں، وقت قید کی جگہ ہے جو آمی سے بے نیاز اور بے زار ہے، اس کے گوشوارے اوپری منزل پر بھیجے جاتے ہیں۔ فائلیں بغلوں کے بوجھ سے دبی جاتی ہیں، خیال کے راستے دوبار کالے ہو کر سامنے سے گذر جاتے ہیں، اعلیٰ برانڈ کے سگرٹوں کی تعداد بڑھ کر پانچ پیکٹ ہو گئی ہے، مغوی کے حواس تو ٹھیک ہیں مگر وہ اس موضوع پر بات نہیں کرتا، پیچھے کے پائے طباق کا بروسٹ اور سردار کی مچھلی کا رعائتی کارڈ مجھے اپنے انکم ٹیکس افسر سے مل گیا ہے، آج کی بہترین ماڈل پہلے ڈائریکٹر کے گھر کام کرتی تھی۔ اُسے اب بھی نہیں پتہ کہ شرقپور کے گلگلے کیسے ہوتے ہیں۔ مگر ہدایتکار شوہر، بیوی کو کیش کرانا چاہتا ہے۔

بدلہ

تمہیں ننگی زمین پر، سوتے دیکھ کر، میرا دل خون ہوتا ہے۔ وہ عمارت جس کے اندر جشن منائے جا رہے تھے، اس کا نام 'راحت کدہ' تھا، اس میں سے، ایک عورت کے پانچ بیٹوں کی جلی ہوئی لاشیں برآمد ہوئیں۔ میرے رشتہ داروں نے انہیں جلا ڈالا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ میں اپنی بے پناہ طاقت کے بل پر، ان فقیر لوگوں کا بدلہ لوں ان کی مشکلات کچھ کم کرسکوں۔ کچھ ادھ جلے لوگوں کو ساتھ لیکر، میں چل رہا تھا، جب کوئی تھک جاتا یا کسی کے پاؤں کے چھالے پھوٹ پڑتے تو، میں اسے کندھوں پر اٹھا لیتا۔ کچھ لوگ، ایک پہاڑ کی غار میں چھپے بیٹھے تھے، جونہی کوئی بھولا بھٹکا مسافر، ادھر سے گذرتا، وہ اسے ہڑپ کر جاتے۔

اوپری منزل

ہم گودام نما بستر کے پابند کر دیئے گئے ہیں، ہمارے اوپر ایک خیمہ چڑھا دیا گیا ہے۔ وہ کہتے ہم نے تمہیں قید نہیں کیا، اس خیمے کی سیڑھیاں ختم ہوتے ہی تمہارا سامان، ٹرنگ، الماریاں، ساری چیزیں، تمہیں وہیں ملیں گی۔ فریم میں لگی تصویریں، سلائی کا سامان، سب کے لیئے، تم آزاد ہو۔ ہمارے اندر مچھلیوں کے تالاب بند کر دیئے گئے ہیں، یہاں ماہی پروری کی اجازت نہیں۔ گودام کے دروازے پر پردے ٹانگ دو، جلد، چاند کی پہلی کرن کے ساتھ کے مندر کا پھاٹک کھلنے والا ہے، وہاں، جھاڑیاں، کنجوں سے نکل کر، مختلف سایوں پیچھے ہٹتی جاتی ہیں۔ ان کی آنکھوں کی جگہ گڑھے ہیں، پیچھے پلٹ کر نہ دیکھو، وہاں کوئی نہیں، بازار میں صرف غبارے بکتے ہیں، بچی کی طبیعت اب پہلے سے بہتر ہو گئی ہے۔ معمر چہرے پر اس قدر جھریاں ہیں کہ کھال سینے تک لٹک آئی ہے، ہُو، کر کے ڈرائے گئے لوگ، سوکھے اور بے جان پاؤں پاؤں سمیٹے بیٹھے ہیں۔ لال بدن، لیس دار مادے سے برہنگی چھپائے، رعشہ زدہ ہاتھوں سے چہرے (گویا خشک پھل کے سخت چھلکے) چھپاتے ہیں۔ دروازہ کھلتے ہی، سیاہ فام اندھیرے کی جڑیں، لٹک آتی ہیں، ایک غول میں بیٹھی چند بد وضع عورتیں، رونگٹے کھڑے کرتی ہیں۔ ان کے کاندھوں پر زندہ چہرے، کھوپڑیوں کی صورت ٹکے ہیں۔ پیشانیاں بھبھوت آلود ہیں۔ کیکڑوں کی طرح رینگتے بچے، خیمے کی سیڑھیوں سے اتر رہے ہیں

قصور

میرا دوست کہتا ہے، جب میں دریافت ہوا، میری عمر ستر سال رہی ہوگی۔ میرا ایک دانت اصلی سونے کا ہے جس کی چمک صدیوں کی دھول میں بھی ماند نہیں پڑی، اس نے مجھے ہڑپہ کے میوزیم میں رکھ دیا ہے۔ حالانکہ میرا ایک بازو کہیں کھو چکا ہے۔ دوسرا بازو وزن اٹھاتے اٹھاتے لٹک گیا ہے، میری صورت بتاتی ہے کہ میں کپاس کے کھیتوں میں کام کرتا تھا، میرے بالوں میں روئی کے کچھ اٹیاں لگی تھیں۔ میرے مکان

سے مٹی کے کچھ برتن بھی ملے ہیں، جہاں سے میری لاش دریافت ہوئی، زمین کے بوجھ نے مجھے پتھر بنادیا ہے، مجھے کچھ کچھ یاد پڑتا ہے، میرا مالک فرعون صفت آدمی تھا، وہ دن بھر مجھ سے کام لینے کے بعد ساری رات بجو کا بنا کر کھڑا رکھتا تا کہ اسکی فصل کی نگرانی جاری رہے، میری سانسوں میں آج بھی اس سے نفرت کا تیزاب لہکتا ہے، ایک بار میں اس کی فصل روند کر گھر سے بھاگ گیا تھا کیونکہ میری ماں میرے ہاتھوں کے چھالے اور پاؤں کے گھٹے دیکھ کر روتی تھی۔ میں میری چمڑی میری ہڈیوں سے چپک گئی تھی۔ مجھے لگتا تھا وہ کسی روز مجھے اپنے مکان کی نیو میں دفن کرنے والا ہے۔ میں سوچتا تھا کہ اتنی لمبی عمر ہار کر بھی میری کوئی نشانی باقی رہنے والی نہیں، میں اپنی فریاد، درختوں سے کہتا، غصے میں ان کی کونپلیں نوچ ڈالتا، لیکن جو آہ بھی پھوٹتی، رائیگاں جاتی۔ آخر مجھے خالی پن سے لگاؤ ہو گیا۔ ایک رات میں نے اسے قتل کرنے کے ارادے سے اسکی دیوار کودی۔ میں آپ کو راز بتا دوں۔ اس نے پہلے ہی وار میں میرا بازو کاٹ ڈالا تھا، بالآخر وہ میرے جبر کا نشانہ بنا، میں نے اسکی روح کو آسمان میں جڑ دیا، اسے ایک ہاتھ سے گھسیٹے۔ میرا دوسرا بازو لٹک گیا، اب کوئی میرا ساتھ دینے پر آمادہ نہ تھا، باقی زندگی جسے میں لس سمجھا، ہوا کی رندھی سانس تھی، میں گھونگے کی چال چلتا، اپنے مقررہ وقت پر، مر گیا تھا، تم میرے ماتھے پر میری چھوڑی لکیروں سے کوئی تاریخ برآمد کر دیا فلسفہ، کوئی شخص میرے دوست اب مجھے اس زمانے میں دریافت کرنے کی بھول کرے تو میرا کیا قصور؟

CLUE

سنسار کی ساری آتماؤں کا جنجال، ایشور نے اپنی فرصت کو، مسلنے کے لیئے، رچا رکھا ہے، موت کے بعد بھی زندگی سے مفر نہیں، جب حواس پانچ تھے تو آسمان سات بنائے گئے، ستاروں، زمین، سورج کو ضرب تقسیم کے جال میں پھڑکایا گیا، پوتھیاں پھرولنا، اس کے ساتھ، جو اکھیلنا ہے، گیم کا خالق کھلاڑی ایک راستہ ضروری بچا رکھتا ہے، ہزار آنکھیں مل کر بھی اسے نیچا نہیں دکھا سکتیں، کوئی باہم گفتگو ہو تو شائد ہی کوئی CLUE ملے لیکن اس نے تو چپ سادھ رکھی ہے، اس کی شاعری بھی عجیب ہے، وہ کہتا بھی ہے مگر زبان استعمال نہیں

کرتا۔ میں اسے اسکے اکھروں میں، ڈھونڈتے ڈھونڈتے، تھک گیا ہوں، وہ انسان بننا پسند نہیں کرتا ہے، میری حیثیت تو اسکے سامنے پڑے کنکر کی ہے۔ مجھے لگتا ہے وہ مجھے راستے میں چھوڑ کر کھسک گیا ہے، دور کہیں تنہائی میں پاؤں پسارے گم سُم لیٹا ہے، اس نے اپنی ہزاروں آنکھیں موند رکھی ہیں مگر اسے، پھر بھی دکھائی دیتا ہے، اس کا کیا بھروسہ، کب میرے سر سے آسمان چھین کر ایک نیا آسمان تان دے، میں کسی مقروض کی شرمندگی لیئے، ہر وقت اپنے حساب کا رجسٹر کھولے بیٹھا رہتا ہوں، میری آنکھیں میری سانس کو روند کر، گرتی پڑتی، گھونگے کی چال چلتی ہیں۔ اس نے مجھے، مجھ پر ہی لکھ رکھا ہے۔ چابی دے کر چھوڑ دیا ہے۔ میں نے ہزار بار سوچا خاموشی سے کہیں سرک جاؤں، مگر اس نے میرے کندھوں پر دو بندر قیمی بٹھا رکھے ہیں۔

حقیر

شراب پیتے اس کی زبان لٹک گئی ہے۔ لوگ اسے پیاسا کتا جانتے ہیں، وہ کوئی سوال نہیں پوچھتا مگر حیرت کی بھی کوئی حد ہوتی ہے، ادنیٰ آدمی پرہیزگار کیسے ہو سکتا ہے۔ گناہ اسے حقیر جانتا ہے، اس سے آنکھ ملائے بغیر گذر جاتا ہے، چھوٹے چھوٹے دکھوں نے اس کی کھڑکیاں ڈھانپ لی ہیں، ان میں تازہ ہوا اور روشنی کا، گذران ممنوع قرار دیا گیا ہے، وہاں صرف پرچھائیوں کو داخل ہونے کی اجازت ہے پرچھائیاں بھی بھوک کی، افلاس کی، بیماری کی۔ اسے خوف میں بند کر کے، چابی دریا میں پھینک دی گئی ہے، اس کے لباس میں کیڑے کلبلاتے ہیں، سانس ناگن بن کر سرسراتی ہے۔ گوشت ٹھیکریوں میں تبدیل کر کے، فرش پر پھینک دیا گیا ہے۔ اس کی زندگی کی واحد خوشی، اُس چمارن کے کالے ہونٹوں پر پھیلی مسکراہٹ تھی، جس میں پہلی اور آخری دعوت دی گئی، اس کی آنکھیں کبھی کبھار ٹہلنے کو نکلتی ہیں۔ مگر باہر نہیں جا سکتیں ۔ درد نے اس کے گھٹنے جوڑ دیئے ہیں، اس کی باہیں لٹک کر پاؤں سے جا ملی ہیں، پاؤں میں زنگ لگ گیا ہے، سگریٹ کے بٹ کئی کئی بار جل کر نشانی، بن گئے ہیں، وہ اب دلن کو پوری طرح نیچا دکھانے کا ارادہ باندھ چکا ہے۔ موت اسے ڈراتی نہیں، وہ خوش ہے کہ بدسلوکی کی ساری وارداتیں سہن کر چکا، اب وہ علامت ہے، خوف کی، موت کی، سارا ناٹک المیہ ہے، اس کا جینا تو محض ایک حادثہ تھا، واقعہ تھا، گذر گیا۔

الم

مجھے ایک الم کی تلاش ہے، ایک ڈراؤنا ناٹک لکھنے کا بندوبست کیا جا سکتا ہے مگر، اسے پہلے سے لکھی گئی کہانی میں تلاش کرنے سے بہت سا وقت بچ جائے گا۔خوف کو پسینہ بن کر بدن سے بہہ نکلنا چاہیئے، تم نے لوگوں کو مرتے دیکھا ہوگا۔خوف کو ذرا اس سے اونچی ذات کا ہونا چاہیئے۔ہاتھ میں کوئی خنجر، کوئی بھالا، کوئی تلوار نہ ہو، بس ایک بریف کیس ہو اور دور کہیں ٹائر کے پھٹنے کا دھماکہ، لوگوں کے دماغ میں شیطان اُگ آئے ہیں، ان کے سروں پر سینگ والی گردنیں نصب ہیں، سپاہی 'مائینز اڑائے جا رہے ہیں، شریفوں کی بیٹیاں پھڑکائی جا رہی ہیں، کچھ لوگ کنارے لگے مذہبی کتابوں کو تیز تیز پڑھتے ہیں، مجھے تو اس جلوس میں جیسے بچے ہنستے دکھائی پڑتے ہیں، چتوں پر گھنی سازشیں لکھی ہیں، بارشیں چاپلوسی کرتی ہیں، راستے بسوں کے پہیّوں میں کھو گئے ہیں، تیز دھار والی ہنسی کبھی سنائی دیتی ہے تو چار پانچ لاشیں گر جاتی ہیں، ساری باتیں ماؤں بیٹیوں میں گم ہیں، یہاں کسی کو تاریخ پیدائش اور تاریخ وفات سے سروکار نہیں، کتبے نصب کرنے کا رواج ختم ہو گیا، لوگوں کے پاس الیے کے نشان بنانے کا حوصلہ نہیں رہا وہ اپنی امانتیں ایدھی کے سپرد رہنے دیتے ہیں، فاتحہ کی جگہ معلوم نہیں کرتے، وقت نے ہمیں ہماری درازوں میں تہہ کر دیا ہے۔ ہمارے سائے اب ہمارے جسموں سے ایکسریز کی طرح گذر جاتے ہیں۔ہم چہرہ مٹے لوگوں سے ہاتھ ملاتے ہیں، ہمارے اندر الم کی خواہش انگڑائی لے کر جاگ اٹھی ہے۔

دعا

بہتی ندی انگڑائی لے کر برسات میں جاگ اٹھی ہے، اپنا پاٹ چوڑا کرتے وہ گاؤں کی اونچی سولنگ کے پار نکل گئی ہے۔اس نے پکے راستے کا موہوم نشان چھوڑ کر دونوں نشیبوں پر قبضہ کر لیا ہے، لوگوں نے صحنوں میں اینٹیں رکھ کر راستے بنائے ہیں۔دروازوں کے آگے ریت کے بند باندھ لیئے ہیں، ہلکورے لیتا پانی، زیادہ غصہ نہیں دکھاتا، دھوتی اٹھائے، لالٹین والا آدمی کچھ گیلی لکڑیوں کو سوکھانے کی آرزو لیئے پانی

میں جونکیں، کیڑے اور سانپ مینڈک سب کو رنگ رلیاں مناتے دیکھتا ہے۔ بابے کو علم نہیں پانی کے دن میں سوکھے گا یا کہاں کتنا گہرا ہے، سال بھر سے مانگی جانے والی دعائیں، برسات بن کر قبول ہو گئی ہیں۔ موسم کو وقت سے پہلے بھیج دیا گیا ہے، بڈھے نے اتنی بربادی پچھلی صدی میں بھی نہیں دیکھی، چڑیاں سہی ہیں۔ بھوکی ہیں، ڈالیاں بھی نہیں بدلتیں، کچھ لوگ بدقسمت پیدا ہو کر، بدقسمت ہی مر جاتے ہیں۔ وہ کسی مسجد میں عمر بھر نہیں جاتے، افلاس اور بھوک کے گھروں میں یرغمال، دالانوں کے کونوں میں پڑے رہتے ہیں، ان کی کڑیوں پر جالے لگے رہتے ہیں۔ بابے کے بزرگوں کی یادگار ایک چمڑے کا ڈھول دیوار کے بڑے کیل سے ٹنگا ہے جو بجنا بھول گیا ہے۔ وہ پانی کے شراپ سے گزرتا، سب جانداروں اور انسانوں کے مرنے کی دعا کرتا ہے۔

سامان

"فارڈیفکس سروسز اوبلی" کے بیت الخلا میں، خالی ہونے والی، بوتل کو ڈال دو، آخری کش لگا کر، بٹ دائیں کونے میں ڈالا جا سکتا ہے۔ اچھے شہری، خطرے کا سائرن بجتے ہی، خندقوں میں کود جاتے ہیں، تم کوئی ایسا کام کر جاؤ کہ ہمیں تمہارا مجسمہ بنانا پڑے، شہر کے لوگ اس تقریب میں ایک مصروف دن گذاریں گے، پتہ نہیں پولیس ہمیں بائیں رہنا کیوں سکھاتی ہے، سائنگی تمہارے چہرے پر بھبوت بن کر چپک گئی ہے، تمہارے دانتوں کے خول سونے اور چاندی کے ہیں، کروڑوں دماغ سڑکوں پر بہہ کر، زندہ ہیں، ریتلی زمین میں مونگ پھلی کاشت ہوتی ہے، بزدل فوجی مہینے بھر کا کوٹہ، ایک ہی رات میں، حلق سے نیچے اتار لیتے ہیں، چہرے ننگے کر لیتے ہیں، بوچڑ خانے کی گمبھیرتا انہیں وراثت میں ملی ہے، دیوار چین پر ٹانگیں لٹکا کر بیٹھنا، جواں مردوں کا کام ہے، ٹریفک سگنلز اب بجلی کے کھمبوں پر لگائے جائیں گے، کارنیگی نے اپنی کتاب میں لکھا ہے۔ جمہوریت 'چندے' کی لونڈی ہے جو "ویل" ملنے تک ناچ سکتی ہے، سارے سازندے اسی رقص کی کمائی کھاتے ہیں، ابھی ایک جیٹ میرے اوپر سے گذر گیا ہے، میں

برآمدے کی جھولا کرسی پر بیٹھا، خانخواہ بڑبڑاتا ہوں۔ میں نے کئی برس کی بیزاری کاٹ کر ہر چیز کو جوتے کی نوک پر لکھنا سیکھ لیا ہے، اب میں عمر کی ریٹائرمنٹ کے آخری سال میں ہوں جہاں لوگوں کی فائلیں بند کر دی جاتی ہیں، گھر سے باہر پھنکا جانے والا سامان کچھ دن باہری برآمدے میں رکھا رہتا ہے۔

جانور

جب ہمارے سروں میں تو تربوز کٹ رہے تھے، تکیوں پر پڑے ہمارے سر، پتھر کے ہو چکے تھے، ان لمحوں میں میں نے کچھ قدیم محاورے یاد کرنے کی کوشش کی لیکن میرے بے لگام دوستوں نے پھول اور گوشت کے فرق مٹا ڈالے۔ ان کا قافلہ تیزی سے میرے 16x12 کے کمرے کی طرف بڑھ رہا تھا، جانور بننے کے لیے بڑے صبر کی ضرورت تھی۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ مسکراہٹوں کو کیسے قتل کیا جاتا ہے۔ کبوتروں کی لاکھ بیٹ بکھری ہو، وہ اڑاتے ہوئے کسقدر خوبصورت اور شانت نظر آتے ہیں، یہاں تو بوڑھے بھی کھانا کھا چکنے کے بعد اندھے ہو گئے تھے، اندھیروں میں لڑکیاں پکڑتے تھے، انہیں چوہوں کی ناجائز نسل سے کوئی سروکار نہیں تھا، مکانوں کی ہر آڑ ایک چاقو کے زور پر فتح کی جا سکتی تھی۔ نارنگیاں نچلے لباس سے محروم، درختوں پر ٹانگ دی گئیں، وہ سات سال تک مکانوں کو چراگاہ کی طرح استعمال کرتے رہے، ہر صدر دروازے کو آدم خور کے جبڑوں کی طرح کھلا رکھتے۔ قدیم سے قدیم تر عورتیں حمل کے عمل سے گذریں۔ حیوانیت چیخی تو گھبرا کے آدمی، بوکھلائے خود کلامیاں کرتے۔ ان کے چہرے پالا لگے مٹروں کی طرح مرجھا چکے تھے۔ ان لمحوں سے نکلنے کا ایک ہی راستہ بچا تھا کہ میں نیند کی نیلی غراہٹوں سے نکل کر ایک کتے کی سی شاندار چھلانگ لگاؤں، لپلپاتی جیبھ اور گھومتی دم سے، اپنا جام ان کے قدموں میں ڈھیر کروں۔

بت پرستوں کا خدا

بت پرستوں کا خدا مر گیا ہے۔ ان کے منتروں کے پیچھے بہت سے چھپے چہرے ننگے ہو گئے ہیں، کاش وہ زندہ ہوتا تو وہ ہذیان بکنے سے بچ سکتے تھے۔ انہیں تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ روئی کا وزن کیا ہوتا ہے۔ اس نے برس ہا برس، برآمدے کے تخت پوش پر ساکت زندگی گذاری، وہ اپنے جنون اور شہر کو لاچارگی سے دیکھتا تھا، عجیب بات ہے، اسے لوگوں کو مارنے کا بھی شوق نہیں تھا، زندگی بھر اس نے چپ کا روزہ رکھا اس نے گھر سے باہر کئی دن کی زندگی گذاری۔ مگر کسی تقریب کا افتتاح نہیں کیا۔ ہمیشہ اپنی تھالی کے کنارے پر بیٹھا رہا، اسے کوئی وراثت نہیں ملی، اسے کئی زندگیاں ملیں، مندروں میں، گھروں میں، بوچڑ خانوں میں، جیلوں میں مگر اس نے کبھی کسی سے سہولت طلب نہیں کی۔ اگر چہ اس کے دانت ایک دوسرے سے جڑے ہوئے تھے مگر انہیں کسی نے کبھی نہیں دیکھا، کسی مریض کی عبادت نہیں کی، ہمدردی کے دو بول نہیں بولے، جب فرعون نے اسکی بہن سے شادی کر لی وہ تب بھی چپ رہا۔ اس کے پانچ بھائیوں نے ایک ہی عورت کی سواری کی۔ اس کا سنگین پیر کئی سروں پر رہا، اس کے سامنے اکثر ذبح کئے ہوئے جسم پڑے رہتے، خون نکل کر نالیوں میں بہہ جاتا مگر کسی نے اسے تکبر پڑھتے نہیں دیکھا۔ اس کے سامنے زرد کوٹھوں کے پیچھے بیٹھی ممیاں سہواس کرتی تھیں۔ وہ ہر پتھر میں بیٹھ کر اذیت کا کوڑھ بھگتتا رہا۔ اسکا سینہ اہرام کی سل تھا۔ لوگ اسے خصی سمجھتے تھے، اس کی کھلی آنکھوں نے سڑتے ہوئے لوگ دیکھے۔ واویلا اور آہ وزاری کرتے ہجوم دیکھے۔ بھید بھاؤ کے اشلوک سنے، لیکن کوئی لفظ ایسا نہیں تھا جو اس کی وسیع وعریض بے چارگی کو زبان دے سکتا۔ آج جب اس پر سے چھت کھنچی گئی ہے تو پہلی بار اس نے گولی کی آواز سنی ہے۔

پرانے خوابوں کی کاٹ

پسلیوں کے چھیدوں میں آنے والے ہزاروں انسان چھپے بیٹھے ہیں، باغ میں بیٹھے گوروں نے حبشیوں کی کھال کے جوتے پہن رکھے تھے۔ مرتے وقت ان کے بدن، گولیاں کھاتے ہی اناج کے ڈھیر میں پہلی مرتبہ دفن ہوئے تھے، دوسری تدفین کی ضرورت نہیں پڑی، اس رات کئی عورتوں نے کیروسین چھڑک کر، خودکشی کر لی تھی۔ ان کی چیخم دھاڑ کو منکوں کی طرح ایک تار میں پرونا ممکن نہیں تھا، چنانچہ بعد میں جب ان پر نظمیں لکھی گئیں تو ان میں زبانی اور مکانی ترتیب برطرف کر دی گئی۔ ان کے آخری الفاظ کسی کے ہاتھ نہیں آتے تھے اور نہ وہ یادیں دکھائی پڑیں، جو بھاگتے وقت وہ چھوڑنے آئے تھے۔ ان کی چپ اور چیخ، دونوں مستقبل کے گڑھے میں گری تھیں، کچھ بوٹوں میں دفناتے وقت ان کی انگلیاں موجود تھیں، جنہیں نکالنا ضروری نہیں سمجھا گیا۔ آج کے آدمی کے پرانے خوابوں کی کاٹ نتھنوں کے بیچ، پیوست ہے

جمائی

کئی بار الفاظ میرے ہاتھوں میں پٹاخوں کی طرح پھٹ گئے ہیں۔ دھماکے کی آواز سن کر سویا ہوا بھگوان، جمائی لے کر جاگ پڑا ہے۔ پتھر میں پھنسا ابلیس مسکراتا ہے۔ کیکڑے فحش گالیاں بکتے میری کھردری انگلیاں بننے کی کوشش میں لگے ہیں۔ جگہ جگہ مرے ہوئے پلّے کے تیز دانتوں کے نشان، کچرے کے ڈھیر سے نکل کر، لوگوں کی ہنسی اڑاتے ہیں۔ جب میں سمندر کے کنارے کودنے کو تیار تھا تو تمہارے ذمے میرے اندر امنگ جگانا طے تھا مگر تم وعدہ توڑ کر میرے پیچھے چل پڑے۔ میری پھٹی ہوئی جیب میں، آخری لفظ بچا ہے۔ مجھے اس کو اپنی آئندہ نسل کے لیے سنبھال کر رکھنا ہے۔

مصنف کی تخلیقات

......کمال مطلوب	تحقیقی مضامین	......اپنائیت کا سفر	نثری نظمیں
......آگہی	تحقیقی مضامین	......منسوخ نیند	نثری نظمیں
......ترغیب	دینی مقالات	......سوچ میں بیٹھے رنگ	نثری نظمیں
......حاجت مطلوب	مجموعہ وظائف	......کروسان	نثری نظمیں
......قرآنی پیشین گوئیاں	قرآن پاک سے	......سرخ موسم	نثری نظمیں
......کیمیاء سعادت	تخلیص	......کمہار کے برتن	نثری نظمیں
......کشف المحجوب	تخلیص	......سات سطروں کی کہانیاں	نثری نظمیں
......کیمیاء ہدائت	تصوف	......دیوانے کا روزنامچہ	نثری نظمیں
......حکایاتِ اولیاء	تاریخی ادب	......برف کی قاشیں	نثری نظمیں
......حکایات صفوریؒ۔غزالیؒ	تاریخی ادب	......گھنے جسم میں ملاقات	نثری نظمیں
......کسب کمال	دینی مضامین	......چڑی کہانیاں	مختصر نظمیں
......گھاس پر لکھی کہانیاں	افسانے	......نمائندہ امریکی نظمیں	ترجمے
......برف پر لکھی کہانیاں	افسانے	......مونوگراف	نثری نظمیں
......زمین پر لکھی کہانیاں	افسانے	......بازگشت	طویل نثری نظم
......مقالات جیلانیؒ	خطبات	......نیند کا گھر	نثری نظمیں

آنے والی کتابیں

......آپ ﷺ	(سیرت النبی ﷺ)	......نبیوں کی کہانیاں	(قرآن پاک سے)

ملنے کا پتہ

یو شع بکس 69 نشیمن کالونی بوسن روڈ ملتان 061-6512747

نئے انداز اور رجحان کا بانی شاعر
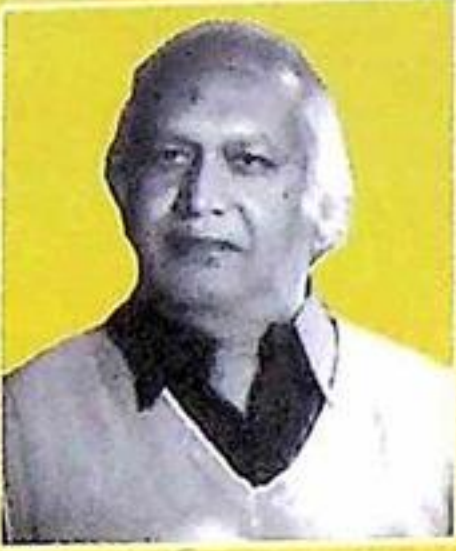
یہ شاہد زبیر کی نیند کا گھر ہے۔ اس گھر میں خوبصورت پلنگ آرام دہ بستر، خواب آور تکیے یا مسحور کن پردے نہیں ہیں۔ یہ سر کٹے خوابوں، ادھڑی ہوئی آنکھوں اور اپنی تعبیر دیکھ کر دہل جانے والے خوابوں کا گھر ہے۔ جس میں ہر طرف ایک عجیب سی شورش، عجیب سا انتشار اور بے یقینی پھیلی ہوئی ہے۔ یہاں جو کچھ ہو چکا ہے وہ نہ صرف انتہائی حوصلہ شکن اور مایوس کن ہے، مستزاد یہ کہ کچھ ہو جانے کا خوف ابھی موجود ہے

ایک متشدد معاشرے کی عکاسی کیلئے شاہد زبیر نے روایتی سانچوں پر اکتفا نہیں کیا۔ اس نے اپنے معروض کا الگ ہی راستہ اپنایا ہے۔ اصناف کا جواز کبھی ختم نہیں ہوتا، اسی طرح اعلیٰ اور کمتر اصناف کی شمار کاری اور درجہ بندی بھی کوئی معنی نہیں رکھتی۔ مختلف ادوار، یعنی سیاسی سماجی صورتحال کے اپنے اپنے مظاہر رکھنے والے عہود میں، مختلف اصناف، حالات و واقعات کے زیر اثر درجہ بندی میں اپنی پوزیشنیں تبدیل کرتی رہتی ہیں۔ میرے خیال میں آج کے المیے کے بیان کیلئے عروضی و گرائمری قواعد والی اصناف موزوں نہیں ہیں۔ یہ شور کا عہد ہے، بے یقینی، تشکیک، گھٹن اور درد کے مختلف ذائقوں سے آشنائی کا عہد ہے۔ ایسے میں روایتی ذرائع اظہار کو بروئے کار لانے پر اصرار کرنا سمجھ سے بالاتر ہے۔ جب زندگی کا کوئی قاعدہ نہیں رہا تو زندگی کے بیان کیلئے قاعدے کی پابندی کیوں ضروری ہے؟

شاہد زبیر نے اپنی تکنیک اور موضوعات کی بے پناہ تنوع کے حوالے سے اس عہد کا سب سے منفرد لکھاری ہے۔ چیزوں کے دیکھنے کا اس کا زاویہ، اسے ہجوم کا حصہ نہیں بننے دیتا۔ دہرائے ہو[illegible] سے کیسے بچنا ہے، یہ اسے اچھی طرح معلوم ہے اس کی تخلیقی صلاحیت پر رشک ہی کیا جا سکتا[illegible] اردو میں ایک نئے انداز اور رجحان کا بانی ہے

ساحر شفیق، ملتان

DASTAK PUBLICATIONS
Gulgasht Colony, Goal Bagh, Multan
Cell: 0302-7766622
Email: dastakpublication@yahoo.com